طوفانِ محبّت

از

هوش بلگرامی

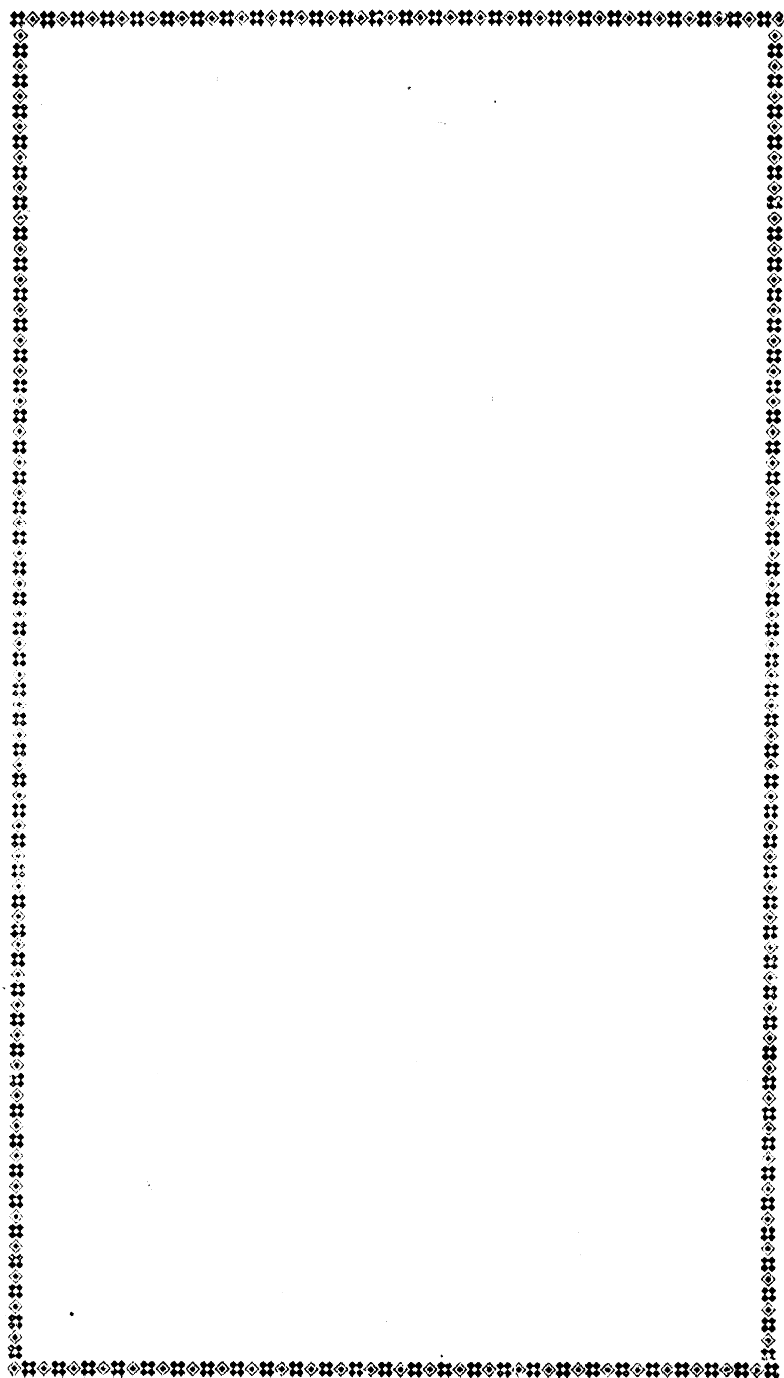
(المخاطب نواب ہوش یار جنگ بہادر)

اُسکے نام پر!

جِس نے مجھے محبت کرنی سِکھائی

۱۶ر فروری سنہ ۱۹۴۴ء

ہوش بلگرامی





ہوش بلگرامی

,, مثنوی سے متعلق کچھ باتیں ،،

مثنوی کی تخلیق اس بہارستان میں ہوئی جہاں دارا کی دارائی دفن ھے اور جہاں کیکاؤس کا شاھانہ جاہ وحشم سرنگوں ھے۔ عرب کے اربابِ فن اسکی خوش سوادی میں نہ چل سکے اور کیونکر چلتے جبکہ یہ تخیّل پسند دماغوں کے ,, اجتہاد شعری ،، کی منتظر تھی۔ گو عرب میں سو سو شعر کے بھی رجز پائے جاتے ھیں مگر ان پر مثنوی کی تعریف صادق نہیں آسکتی بسیط مثنوی کا تو ایران ھی باغبان ھے آسی نے اس درخت کو لگایا، آسی کی آبیاریوں نے اس کی نشوونما کی اور آسی نے فارسی شاعری کے باوا آدم رودکی کو اس کی گلچینی کے لئے زندگی عطا کی، عنصری کو ,, وامق عذرا ،، کی داستان عشق نظم کرنے کے لئے تیار کردیا اور فردوسی کو ,, شاھنامہ ،، کی تکمیل سے غیر فانی بنا دیا اور نظامی کو ,, خمسہ ،، کے سہارے نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچا دیا ان کے علاوہ اسدی طوسی نے اپنی لغت میں ابوشکور طبان اور لبیبی کے نام بھی مثنوی گویوں میں گنائے

هیں چونکہ ھندوستان ایرانی ھاتھ پر شاعری کی بیعت کرچکا تھا اس لئے محبوب الٰھی رح کے خوش فکر مُرید (خسرو) نے ایک ایک سانس میں نہ معلوم کتنی مثنویاں جُھوم جُھوم کر سُنا ڈالیں۔

مثنوی فن شعر کی اصطلاح میں ایسی نظم کا نام ھے جسکی ھر بیت میں جُدا گانہ قافیے استعمال کئے جائیں۔ اس کا میدان ایسا وسیع ھے جس میں بے تکان دوڑیں لگائی جاسکتی ھیں یورپ کا ھومر ایران کا رودکی اور دلّی کا جرأت باوجود مادر زاد اندھے ھونے کے اس میدان میں ”انکھیارے“ ھیں۔ اس میں جدھر سینگ سمائے چلئے پھریئے، جتنا چاھئیے دوڑیئے، جتنا چاھئے پھیلئے اور اس ”صفاچٹ“ میدان کو اپنی شاعرانہ کُلیلوں سے روند ڈالئے - اس میدان کا ھر ذرّہ (شعر) اپنی مُستقل حیثیت رکھتا ھے نہ اس میں اشعار کی کسی تعداد کا تعیّن ھے اور نہ اس میں مضامین کی کوئی تخصیص ھے۔ اس میں رزم کی تلواریں چمکایئے، بزم کی چھل پہل دکھایئے، حُسن و عشق کے واردات کا نقشہ کھینچئے، تصوّف کے

فلک فرسا نعرے مارئیے، فلسفہ کی اُلجھنوں میں پڑئیے، رنج و مسرت کے حقائق بیان کیجئے، غیظ و غضب کے تیور دکھائیے، کینہ و انتقام کی پیاس بُجھائیے، شجاعت و بہادری کے پینترے دکھائیے اور واقعات کی کھری کھری باتیں بھی سُنا دیجئے۔ تلاش سے اگر دماغ تھکتا نہیں ہے تو مضامین سے مضامین پیدا کرتے چلے جائیے، اجمال کی تفصیل اور اشارات سے مافی الضمیر تک رسائی حاصل کرلیجئے، اِسی میں قافیوں والی غزل بھی نکال لیجئے اور اِسی میں قصیدہ کی بھی شان و شوکت پیدا کرلیجئے۔

یہ انسانی جذبات کا بھی خیر مقدم کرتی ہے اور مناظرِ قدرت سے بھی آنکھوں کو تازگی بخشتی ہے اِسکے یہاں بہار و خزاں کا بھی پھیرا ہوتا ہے، گرمی و سردی کے موسم بھی آتے ہیں، برسات کا ابرِ رحمت بھی برستا ہے اور میکدے کے جام بھی چھلکتے ہیں، صبح کا اُجالا اور شام کا اندھیرا بھی اِسکی رہنمائی کرتا ہے جنگل و بیابان کا سنّاٹا بھی یہیں محوِ خواب رہتا ہے کوہ و صحرا کی آوازِ بازگشت بھی یہیں ٹکراتی ہے، تاریخی واقعات بھی اِسی بزم میں کہانیوں کی طرح سُنے جاتے ہیں۔

غرضکہ انسانی جذبات ہوں یا مناظر قدرت، ملکی و قومی انقلابات ہوں یا مرنے جینے کے حوادث سب اس وسیع و بسیط میدان میں حُسن کے ساتھ کھپتے چلے جاتے ہیں۔ غزل میں یہ وسعت کہاں ۔! جبتک قافیے و ردیف اسکے ہم جلیس نہ ہونگے وہ اپنے وجود کو ثابت ہی نہیں کر سکتی۔

اردو شاعری فن کی حیثیت سے فارسی شاعری کی گرانبار منت ہے فارسی میں جو اصناف شعر مقبول اور متداول تھے انہیں کو اردو میں بھی رواج دیا گیا اور فن کے انہیں خطوط پر چلنے کی کوشش کیگئی جو فارسی کے اہل کمال نے کھینچے تھے۔ زمانہ اگرچہ کروٹ بدل چکا ہے اور نئی نسلیں شعر و ادب کی بساط کو بھی بدل دینے پر تُلی ہوئی ہیں لیکن محتاط اہل فن زبان و بیان کے سانچوں کو بدلنے میں تو زیادہ بیگانگی محسوس نہیں کرتے لیکن فن کے زاویوں کی تراش خراش ان پر اب بھی گراں ہوتی ہے۔

مثنویوں کی اس ہمہ گیر عظمت نے ہر شاعر کو اسلئے اسکی طرف متوجہ کردیا کہ ان کا اس پر ایمان تھا کہ مثنوی کے بغیر انکے فنی کمالات کی تکمیل نہ ہو سکیگی اسی نے " شاہنامہ اور سکندر نامہ " جیسی کامیاب نظمیں

لکھوائیں جن میں ایک طرف رزم کی تلواریں چمک رہی ھیں تو دوسری طرف بزم کی دلکش لطافتیں بھی مُسکرا رھی ھیں اور زبان کی صفائی اور لچک کی داد تو رُکن آباد ھی کی فضا دے سکتی ھے لیکن کردار ان میں بھی حقیقی نہیں ھیں جبھی تو فردوسی نے خود کہدیا کہ :-

منش کردہ ام رُستم داستاں وگرنہ یلے بود در سیستان

چونکہ ابتداء ھی سے مثنوی کا واقعاتی امور سے تعلق رہا ھے اور جسکو نظم کا شعبۂ تاریخ کہنا زیادہ موزوں ھوگا اسلئے اس میں جس طرح نثر کی بعض تاریخیں محض روایات پر مبنی ھوتی ھیں اسی طرح نظم کے شعری مبالغوں نے مثنوی کے اجزاء ترکیبی کچھ ایسے کردئیے ھیں جنکی کوئی عقلی توجیہ نہیں کی جاسکتی اور کیونکر کیجائے جبکہ مثنوی کی بُنیاد محض تصوری اور روایاتی باتوں پر رکھی گئی ھے اور اسی کو حُسن سمجھا گیا ھے - یہ تھے وہ جاذب توجہ اسباب جنکی وجہ سے ھندوستان کے شعراء کا نچلا رھنا ناممکن تھا انھوں نے بھی مثنویوں کی طرف توجہ کی میرحسن نے بدر منیر سے تعارف کرایا تو گومتی میں ھیجان

کیوں نہ پیدا ہوتا آتش نے نسیم کو اُبھارا اور شوق نے "زھرعشق" کو اُچھالا اور ایسا اُچھالا کہ نیندیں حرام کر دیں، آنکھیں سُرخ ہو گئیں، ہچکیاں بندھ گئیں اور وہ سب کچھ دلوں پر بیت کر رہا جو نوچندی جمعرات کے شوق میں:—

پان کل کیلئے بناتے جائیں

پر گُزرا تھا۔

گو "بدر منیر" اپنی افسانوی ترکیب کے لحاظ سے خارج از عقل واقعات پر مبنی ہے مگر اس کی "لطافت زبانی" اور "محاکاتی سماں بندی" کا جواب مشکل سے مل سکیگا یہی حال "گلزار نسیم" کا بھی ہے جو اپنے اختصار اور شکوہ بیانی کیلئے تو مشہور ہے لیکن جسکے تمام کردار تصوری ہیں۔ رہ گئی "زھرعشق" وہ یقیناً اسی آب و گِل کی چلتی پھرتی دنیا سے بہت کچھ تعلق رکھتی ہے اور واقعات کے لحاظ سے بھی بعید از عقل نہیں سمجھی جا سکتی لیکن سیرت و اخلاق کی دنیا میں اسکے ہیرو کا کردار بہت ہی عامیانہ ہے اور باوجود اسکے چونکہ یہ ایک انسانی "ٹریجڈی" ہے اسلئے قلب متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔

اور کچھ انہیں مشرقی اربابِ کمال پر منحصر نہیں ہے

دوسری قدیم اور جدید زبانوں میں بھی ھمیں اسی قسم کا افسانوی ادب کثرت سے ملتا ھے۔ ملٹن کی ''پراڈائزلاسٹ'' ڈانٹے کی ''کامڈی'' اور گیٹے کی ''فاوسٹ میں'' جہاں نفسیاتی حقائق کی کمی نہیں ھے اور اصول حیات کے صحیح مدارج سے بحث کیگئی ھے وھاں انکے بھی کردار اکثر تصوّری ھیں۔ غرض کسی نے کہا ھے اور سچ کہا ھے کہ:۔

''چلنے والے اونٹ سے اڑنے والے اونٹ کا قصّہ زیادہ دلچسپ ھوتا ھے''

قدیم آفاقی ادب میں انسانی سیرت و اخلاق اور تہذیب و تمدن کی تعمیر کیلئے ایسے ھی افسانے وضع کئے جاتے تھے اور اسمیں جتنے بھی کردار مہیّا کئے جاتے تھے وہ قصّہ کی ظاھری علامات کے طور پر ھوتے تھے مگر جنکے گردو پیش اخلاقی تصوّر ضرور ھوتا تھا۔ کہیں سعی وعمل کے سبق دئے جاتے تھے، کہیں علم وعقل کی راھیں دکھائی جاتی تھیں اور کہیں صداقت کے راز سمجھائے جاتے تھے تاکہ اس طرح سے ان انسانی صفات کی بنیادیں استوار ھوسکیں۔

رفتہ رفتہ زمانہ کا رُخ بدلا اور اخلاق وعادات پر کشمکش حیات کے عصری تصوّرات اسقدر چھا گئے

کہ دُنیا ان تصوّری اور خیالی کرداروں سے اپنا دامن بچانے لگی اور ارباب فکر خواہ نثر ہو یا نظم سب کو عقل اور سائنس کے سایہ میں دیکھنے لگے اور اسی آب و خاک کے مظاہر و آثار سے کام لینے لگے ۔

"طُوفان محبت" بھی اسی ماحول میں شروع کی گئی تھی جب توہم پرست انسان دیو اور پری کے افسانوں سے بہت کچھ دلچسپی رکھتا تھا اور گو مولانا حالی کا مقدمۂ شعر و شاعری اور مولانائے آزاد و شبلی کی واقعاتی نظمیں قدیم شاعری کی بُنیادیں ہلا چکی تھیں پھر بھی صدیوں کے رچے ہوے تصوّرات یکایک فراموش نہیں ہوسکتے تھے اسلئے ممکن ہے کہ اسکے پلاٹ میں بھی آپ کو قدامت کی کہیں جھلک نظر آجائے لیکن اِس میں جتنے بھی کردار ہیں وہ اسی انسانی دُنیا سے تعلق رکھتے ہیں اور جن رسوم و قیود میں دُنیا گم ہو کر رہ گئی ہے اور جو اخلاق و عادات مَسخ ہو کر رہ گئے ہیں اور جس تہذیب و تمدن کو ہم نے بُھلا دیا ہے آسکو یاد دلانے کی ایسے انداز میں کوشش کیگئی ہے کہ چوٹ تو لگے مگر درد محسوس نہ ہو۔

اس مثنوی کا سلسلہ تو ربع صدی پہلے شروع ہو گیا تھا مگر ختم ہونے سے قبل ہزاروں شعر کہے گئے اور قلم زد کر دئے گئے نہ معلوم کتنی مرتبہ پلاٹ بدلا گیا اور کتنی مرتبہ ان پر یہہ سوچکر نظریں ڈالی گئیں کہ شعر و ادب کی دُنیا بہت کچھہ بدل چکی ھے اور " بدر منیر " اور " گل بکاولی " کے خیالی مضامین پر اب کون وجد کرسکتا ھے اب تو نفسیاتی حقائق کی ضرورت ھے جن میں زندگی کے تجربات ظاھر کئے جائیں اور وہ مُشاھدات بیان کئے جائیں جو عقل کی کسوٹی پر کسے جاسکیں کیونکہ وہ زمانہ گزر گیا جب ھم دیو پری کی داستانوں سے خوش ھوا کرتے تھے اور بعید از عقل باتوں پر ایمان لے آتے تھے اس لئے اس میں محبت کے جذبات کے ساتھہ ایسی باتیں بھی کہدی گئی ھیں جن کو میں انسانی زندگی کے لئے ضروری ھی نہیں ناگزیر سمجھتا ھوں ۔ اسی نقطۂ نظر سے اس کو نظم کرنے کی کوشش کی گئی ھے اور میں نے اپنے اطمینان کے لئے اس کے اکثر حصّے اُن احباب کو بھی سُنائے جو ایك طرف شعر و سخن کا بھی بلند ذوق رکھتے ھیں اور دوسری طرف علم و عقل سے بھی بھرہ مند ھیں اُنھوں نے اس کو نہ صرف توجہ اور دلچسپی کے ساتھہ سُنا بلکہ بعض مقامات پر متاثر بھی ھوے ۔

کسی کتاب کے مطالعه سے اگر انسان کوئی مفید سبق نه لے سکے اور اس کی زندگی کوئی اصلاحی کروٹ نه لے تو ایسا مطالعه تضیع اوقات سمجھا جائیگا اس لئے زمانه کے ضروریات کا تقاضا ھے که مختلف صورتوں سے اُن امور کی طرف ذهنِ انسانی کو متوجهه کیا جائے جن سے زندگیاں گُمراه نه هونے پائیں اور یہی وه مقصد تھا جس نے مجهه سے اس مثنوی کی لپیٹ میں ایسی باتیں بھی کہلوادیں جو میرے دل میں همیشه کھٹکتی رهتی هیں۔

دوسری مثنویوں کی طرح اس مثنوی میں بھی عشق ومحبت کی چاشنی ھے مگر ایسی چاشنی جس سے اخلاق کے دامن پر دھبّا نه آنے پائے اور اس لئے هر مناسب مقام پر جس قسم کے اخلاقی پہلووں کو اجاگر کیا جاسکتا تھا اُس کو اجاگر کئے بغیر میں آگے نه بڑھ سکا۔

ممکن ھے که ناظرین کو ”کامران“ کا پیدائشی حصه پچھلی مثنویوں کی ”صدائے بازگشت“ معلوم هو مگر کیا کیا جائے که ”کامران“ کی پیدائش کی حقیقت ”معتبر راویوں“ سے اسی طرح سُنی گئی اور جس کو بلا کسی شك وشبه کے اس لئے بھی یقین کرنا پڑا که ایسے واقعات اس دنیا میں اب بھی هوتے رهتے هیں اور میرا تو ایقان ھے که بغیر تدبیر کے دنیا کا کوئی کام انجام نہیں پایا کرتا مگر دوا کے

ساتھہ دعا کے نفسیاتی اثرات سے بھی انکار ممکن نہیں۔

شاعری ہو یا مضمون نگاری اس میں سب سے پہلے اطمینان قلب کی ضرورت ہوتی ہے اور یہی چیز مجھکو اپنی زندگی میں کبھی نصیب نہ ہو سکی۔ کسی نہ کسی اُلجھن میں ہمیشہ مبتلا رہا جب کبھی دماغی سکون نصیب ہوتا مضامین بھی لکھتا رہتا اور جب کبھی طبیعت موزوں ہوتی اور شاعرانہ جذبات کروٹ لیتے تو اس کو بھی نظم کر لیتا اور غزلیں کہہ کر واردات قلب کی ترجمانی کرتا رہتا مگر میرا قلب اُسوقت تك مطمئن نہیں ہوتا جبتك میں نظم ہو یا نثر اُس پر متعدد نگاهیں نہ ڈال لوں اور معنویت کے ساتھ ساتھ لفظی ترنم بھی نہ پیدا کر سکوں اس لئے یہ مسودہ شائد اب بھی مطبع کے حوالے نہ ہو سکتا اگر سوال "امتثال امر" کا نہ ہوتا کیونکہ میں فطرتاً نہایت لاپرواہ انسان ہوں اور "شُہرت" کو بھی ایك طرح کی "رسوائی" ھی سمجھتا ہوں اور یہ بالکل حقیقت ہے کہ اس مثنوی کی اشاعت کا مقصود خود اپنے "ذوق" کی "تسکین" نہیں بلکہ کسی کے "فرمان محبت" کے سامنے سر جھکا دینا ہے۔

رامپور میں جب مجھے "عروس ادب" کے چھپوانے کا خیال ہوا تھا تو اپنے ذوق کے لحاظ سے میری تمنا یہ تھی کہ اِسکی کتابت اور طباعت

"نامی پریس"، کانپور کی ایسی اگر نہ ہو سکے تو اُس سے لگ بھگ تو ہو جائے جسکے لئے وصل بلگرامی مرحوم نے کوشش کی اور جناب نیاز فتحپوری اسکی نگرانی کے ذمہ دار ہوئے تھے مگر "عروس ادب" جیسی چھپنی چاہئے تھی نہ چھپ سکی وہی تمنا اس مثنوی کے لئے بھی تھی میں چاہتا تھا کہ کوئی "عماد ثانی" اس کو لکھے اور "رعد کانپوری" صرف اسکی طباعت کے لئے زندہ ہو جائیں مگر نہ کوئی "عماد ثانی" ملا اور نہ "رعد کانپوری"، "قُم باذنی" سے اُٹھ سکے اور جب تقریباً ایک سال اس جستجو میں ضائع ہو گیا اور کوئی صورت "بقدر ذوق" نہ نکلی تو بجائے لیتھو کے نسخ ٹائپ کو ہر لحاظ سے ترجیح دینی پڑی -

مطالعہ کے وقت اسکو پیش نظر رکھنا چاہئے کہ اس مثنوی کے واقعات کا تعلق غدر کے مِلتے جُلتے زمانہ سے ہے اور شاعری کے اعتبار سے اسکے ڈانڈے کہیں کہیں ادب جدید کے درمیانی عہد سے بھی مل جاتے ہیں جو ممکن ہے کہ اصولی تنقید پر گراں ہوں لیکن اس میں بعض ایسے مقامات بھی نظر آئینگے جو عصر حاضر کی ادبی تنقید کا بھی موضوع بن سکتے ہیں فقط

۱۶ - فبروری سنہ ۱۹۴۴ع — ہوش بلگرامی

سرفراز منزل - حیدر آباد دکن

مقدمہ

یہ مثنوی اب سے تقریباً ۲۵ سال قبل کی تخلیق ھے جب حضرت ہوش بلگرامی (نواب ہوش یار جنگ بہادر) بلحاظ فکر و احساس ایک زندہ اور زندگی پسند شاعر و انسان کی حیثیت رکھتے تھے یعنی نہ ان کی غیر معمولی ذکاوت حس نے کوئی قنوطی کیفیت ان میں پیدا کی تھی اور نہ دنیا کی فکریں ان کی شوخیوں اور رنگینیوں کو مغلوب کر سکی تھیں۔

یہ وہ زمانہ تھا جب میں بھوپال میں تھا اور جناب ہوش رامپور میں۔ وہ اپنے مشہور رسالہ "ذخیرہ" کو عرصہ تک کامیابی کے ساتھ جاری رکھنے کے بعد حیدرآباد چھوڑ چکے تھے اور میں نگار کی بنیاد استوار کرنے کے لئے بھوپال چھوڑنے کیلئے پر تول رہا تھا۔

اس زمانے میں ایک بار انکی کشش مجھے رامپور لے گئی اور وہیں سب سے پہلے انہوں نے اپنے دلکش لحن میں مجھے اس مثنوی کے بعض اجزاء سنائے اور میں نے اپنی اشک آلود آنکھوں کے ساتھ

آنھیں سنا ۔ شاعرانہ داد دینے کا مجھے سلیقہ حاصل نہیں لیکن اگر ھوتا بھی تو میں آن مراسم خلوص کو دیکھتے ھوے جو میرے اور جناب ھوش کے درمیان قائم ھیں غالباً اس سلیقہ سے کام نہ لے سکتا اسلئے میں یہ مثنوی سُنکر خاموش ھوگیا اور رات کی تنہائیوں میں بارھا سوچتا رھا کہ شعر و نغمہ بھی انسان کے اندر کس کس طرح چُھپا رھتا ھے اور جب کبھی وہ اپنے صحیح وقت پر ظاھر ھوتا ھے تو کِتنی دِلکش صورت اختیار کرلیتا ھے ۔

غالباً کیا یقیناً جناب ھوش نے یہ مثنوی اسلئے نہ لکھی تھی کہ وہ اسکی اشاعت کرکے مُلک سے داد سخن چاھتے اسی لئے جب ایک صحبت میں میں نے اسکی اشاعت کا ذکر کیا تو وہ خاموش ھوگئے اور پھر عرصہ تک مجھے بھی یہ پوچھنے کا موقعہ نہ ملا کہ مثنوی کیا ھوئی ۔

اس دوران میں وہ رامپور چھوڑکر پھر حیدرآباد پھونچ گئے اور میں بھوپال سے لکھنؤ چلا آیا وہ اپنی ملازمت کی اُلجھنوں میں پھنس گئے اور میں اپنے کاروبار کی فکروں میں مبتلا ھوگیا کئی سال گزرنے

کے بعد انہوں نے پھر مجھے یاد کیا اور جب میں حیدر آباد پہونچا تو حالات کچھ ایسے تھے کہ انکی زندگی خود اِک نئی کہانی اپنے لئے تیار کر رہی تھی اور اُس دور کا ذکر بھی ممنوع تھا جب وہ مثنوی لکھنے کے حال میں تھے

اسکے بعد یہ کہانی بنی بھی، لوگوں نے سُنی بھی اور ختم بھی ہو گئی اور آخرکار انہیں پھر اُنہیں پُرانی باتوں کا ہوش آیا جنکی لذّتیں نئی باتوں میں گم ہو گئی تھیں انہوں نے پھر مثنوی کے اوراق اُٹھائے (اعادۂ مسرت کیلئے نہیں بلکہ شائد غم غلط کرنے کیلئے) اور پھر اُسکا ذکر چھڑ گیا۔

جناب ہوش بڑے عُجلت پسند اور نہایت شدید جذباتی قسم کے انسان ہیں ان کی طبیعت یوں سمجھئے کہ ایک طوفان ہے جس میں آندھی، کڑک، اور بجلی سبھی کچھ شامل ہو لیکن مثنوی کے باب میں بالکل خلاف معمول وہ یکسر نسیم سبکر و ثابت ہوئے اور اس طرح آہستگی و احتیاط کے ساتھ انہوں نے اسکی نظر ثانی شروع کی گویا اس کام کو کبھی ختم ہی نہیں کرنا چاہتے۔ میرے علاوہ انکے دوسرے احباب نے بھی سُنا اہل فکر و نظر نے بھی سنا اور سب کا یہی تقاضہ

هوا کہ اسکو شائع ہونا چاہئے لیکن اِس مسئلہ میں وہ ہمیشہ خاموش رہے۔

زمانہ گزرتا گیا اور انکی نگاہ دقّت پسند برابر اِس میں حذف و اضافہ کرتی رہی یہانتک کہ سب سے آخری مرتبہ (غالباً اب سے دو سال قبل) جب میں حیدر آباد گیا تو معلوم ہوا کہ اب وہ اِسکی اشاعت پر آمادہ ہیں۔

جناب ہوش کا جمالیاتی ذوق بڑا بلند و پاکیزہ ہے آنکے یہاں حُسن و خوبی کا ایک ہی درجہ ہے اور وہ نہیں تو کچھ نہیں۔ اگر کوئی چیز آنکی نگاہ میں ''خوبتر'' نہیں تو بُری ہے وہ خوب کے قائل نہیں عرش کے بعد آنکے یہاں فرش ہی ہے درمیانی منزل پر آنکی نگاہ کبھی نہیں جاتی اسلئے وہ چاہتے تھے کہ مثنوی بھی آسی معیار کی ہو اور آنکی ژرف نگاہی اِس باب میں کسی طرح مطمئن نہ ہوتی تھی لیکن حُسنِ اتفاق کہ آس زمانہ میں یہ مثنوی بعض ایسی نگاہوں سے بھی گزری جو بجائے ''عرض نیاز'' کے ہوش صاحب کو حکم بھی دے سکتے تھے اور اس طرح جس کام کو دوستوں کی التجائیں پورا نہ کرسکتی تھیں وہ کسی کے حکم سے پورا ہو گیا۔

مثنوی بیانیہ شاعری ہے اور فن شعر کی ابتدا اسی سے ہوئی بعد کو شاعری نے مرثیہ قصیدہ غزل اور خدا جانے کیا کیا صورتیں اختیار کیں لیکن ہیں یہ سب مثنوی ہی کی مختلف شکلیں اور ان میں اگر کوئی فرق ہے تو صرف یہ کہ مثنوی میں واقعات و جذبات دونوں پائے جاتے ہیں اور دیگر اصناف سخن میں زیادہ تر محض جذبات یعنی اگر مثنوی کی واقعہ نگاری ترک کر کے محض "جذبات رثاء" سے کام لیا گیا تو مرثیہ ہو گیا صرف تاثرات مدح و تقدس پیش کئے گئے تو اسے قصیدہ کہنے لگے اور خالص کیفیات محبت کا ذکر کیا گیا تو اس کا نام غزل ہو گیا۔ بہر حال مثنوی شعر و شاعری کی دنیامیں بڑی اصولی و فطری چیز ہےاور اسی لئے با وجود آسان ہونیکے بڑی مشکل! آسان اسلئے کہ ہر موزوں شعر مثنوی کا شعر ہو سکتا ہے اور مشکل اس لئے کہ حالات و واقعات کو اس طرح پیش کرنا کہ تسلسل بیان اور اظہار واقعیت کے ساتھ ساتھ ان کا نفسیاتی و جمالیاتی تجزیہ ہو تار ہے آسان بات نہیں اور اسلئے اردو میں اسوقت تک خدا جانے کتنی مثنویاں لکھی گئیں لیکن ان میں صرف چند درجۂ قبول حاصل کر سکیں۔

میں نہیں کہتا کہ جناب ہوش کی یہ مثنوی فنی خوبیوں کے لحاظ سے کوئی ایسی چیز ھے جسکا جواب ممکن نہیں اور نہ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ پلاٹ کے لحاظ سے اس میں کسی نُدرت و جدّت سے کام لیا گیا ھے لیکن یہ کہنے میں مجھے مطلقاً تامل نہیں ہو سکتا کہ مقصود کے لحاظ سے یہ بالکل نئی چیز ھے اور جس مقصد کو سامنے رکھکر اسے لکھا گیا ھے اس کی تکمیل کیلئے جس غیر معمولی سلیقۂ فکر اور جن ذہنی خصوصیات کی ضرورت تھی وہ جناب ہوش کے سوا مشکل ھی سے کسی اور میں پائی جاسکتی ھے۔

حضرت ہوش اسقدر عجیب انسان ھیں کہ انکا درجہ متعین کرنے میں بڑی دشواریاں پیدا ہوتی ھیں ، طبیعت میں حد درجہ سوز و گداز لیکن مزاج معشوقانہ ، فطرت از بس نرم و لطیف، لیکن انداز آمرانہ ! جہانتک خود آنکی ذات کا تعلق ھے بے انتہا مآل نا اندیش و بے پروا ، مگر دوسروں کیلئے انکا ھر ھر لفظ حکیمانہ و فلسفیانہ !

ذہین ہستیاں اکثر جامع اضداد ہوا کرتی ھیں لیکن شائد اتنی نہیں جن حضرات نے انکی ادبی زندگی کا مطالعہ کیا ھے وہ اچھی طرح جانتے ھیں کہ انکی فطرت کی یہی خصوصیت اُنکی شاعری و نثر نگاری

میں بھی پائی جاتی ہے قصیدہ تو انہوں نے آج تک کہا نہیں اور نہ اس قسم کی مدح سرائی انکا ذوق لیکن انکی غزلوں کو دیکھئے تو وہاں بھی یہی کیفیت نظر آئیگی کہ دفعتاً وہ عشق کرتے کرتے چونک پڑتے ہیں اور معشوق کو چھوڑ چھاڑ کر ،،رومی و عطار،، کی سی باتیں کرنے لگتے ہین انکے مقالات نثر اٹھا کر دیکھئے تو یہ خصوصیت اور زیادہ نمایاں طور پر سامنے آجاتی ہے تحریر و انشاء مین وہ غضب کی شوخی و رنگینی کہ معلوم ہوتا ہے فضا رقص کر رہی ہے لیکن اس کے ساتھ احتساب اخلاق بھی اتنا تیز و تند کہ معاذاللہ ! گویا علیؑ کے ھاتھ میں دُرّهٔ عمرؓ دیدیا گیا ہے۔

الغرض جناب ہوش باوجود غیر استفادی ہونے کے اسقدر افادی واقع ہوئے ہیں کہ۔ انکا مطالعہ نہ صرف یہ کہ دُشوار بلکہ سچ پوچھئے تو ایک حد تک خطرناک بھی ہے ! کیونکہ عین حالت مستی میں بھی اپنا تو نہین لیکن دوسروں کا مزہ کرکرا کرنے میں انہین یدطولیٰ حاصل ہے۔

یہ توضیح اسلئے ضروری تھی کہ جب تک کسی کو جناب ہوش کی ان خصوصیات کا علم نہ ہو وہ نہ انکی

شاعری سے لُطف اٹھا سکتا ھے اور نہ وہ آسانی سے یہ سمجھ سکتا ھے کہ اس مثنوی کا مقصود کیا ھے

آجکل شعر و شاعری کے سلسلہ مین ایک نقّاد کو ھمیشہ یہ جستجو ھوتی ھے کہ شاعری میں کوئی انفرادیت پائی جاتی ھے یا نہیں اور اگر ھے تو کیا۔ لیکن ھمارے قدیم شعرا اس قدر رسید ھے یا اتنے چالاک تھے کہ انھوں نے اپنی انفرادیت کو کبھی نمایاں ھونے ھی نہ دیا یا نمایاں نہ کر سکے اور اگر کسی کے کلام مین کوئی انفرادیت نظر آتی بھی ھے تو اس کا تعلق زیادہ تر معیار شاعری یا "ٹکنک" سے ھے۔ خود شاعر کی ذات سے نہیں۔

جناب ھوش کی زندگی اس لحاظ سے بالکل کُھلی ھوئی کتاب رھی ھے اور اُن کے افکار میں خواہ نظم ھوں یا نثر ان کی ذاتی انفرادیت اتنی نُمایاں ھے کہ اگر کوئی چاھے تو اُن کو پڑھکر ھوش کا کیرکٹر بہ آسانی پڑھ سکتا ھے آپ اُن کا کوئی مقالہ ایسا نہ دیکھیں گے جس میں تاریخ و اخلاقیات کے چھینٹے نہ پائے جائیں اور ان کی شاعری یہاں تک کہ تغزل میں بھی ان کے "نشہ بخش" انداز بیان کے ساتھ ساتھ "کیف شکن" تلخیاں ضرور پائینگے۔ الغرض رندی و احتساب کا اجتماع ھوش کے یہاں بہت نُمایاں ھے اور

اس لحاظ سے ان کی شاعری میں جو انفرادیت پائی جاتی ہے وہ دراصل ان کے ذاتی کیرکٹر کی انفرادیت ہے جو اس افسانہ میں بھی ہر ہر موڑ پر نظر آتی ہے۔

ہوسکتا ہے کہ جناب ہوش کی یہ آفتاد طبع بالکل فطری ہو لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس میں استحکام پیدا ہوا یقیناً ماحول سے۔ جناب ہوش کا وطن بلگرام کی سر زمین ہے وہ سر زمین جس کا خمیر ہی شائد فضل و کمال سے ہوا تھا۔

خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہوگئیں

اسلئے وہ اپنی رنگینی اپنی ذہانت تو یقیناً اپنے ساتھ لیکر آئے تھے اور تمام اُن اسباب کے ساتھ جن کے ہوتے ہوئے گُمراہ نہ ہونا بھی گناہ ہے لیکن قسمت نے اُنہیں ایک ایسی ہستی کی نگرانی میں دیدیا جو نہ صرف اپنے علم و فضل بلکہ اپنے اخلاق کے لحاظ سے بھی انتہائی معتدل اور نِتھری ہوئی خصوصیات کا مالک تھا اور اُس ہستی سے میری مُراد نواب عماد الملک مرحوم کی ذات گرامی ہے۔

نواب عماد الملک مرحوم (سید حسین بلگرامی) کے خصوصیات کے متعلق لکھنا تحصیل حاصل ہے اُن کی ذات، اُن کی زندگی اور اُن کے علمی خدمات

سب نے اب کلا سکل حیثیت اختیار کرلی ھے اور جبتك اورنگ آباد کے اجنٹا اور ایلورہ کو دُنیا نہیں بھُلا سکتی حیدر آباد کے ,, عماد الملك ،، کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا لیکن ھوش نے اس مقدس ھستی کی صحبت سے کیا اثر قبول کیا اَس کا اظہار مختصراً ضروری ھے ۔

غفران مکان حضرت آصف جاہ سادس کا زمانہ ھے اور حیدر آباد کے ,, ملبوس مملکت ،، میں چُن چُن کر تمام وہ جواھر نصب کئے جا رھے ھیں جن پر ھندوستان کو فخر تھا یہاں تك کہ آخر میں جب ,, طُرّہ ودیہیم ،، کی آرائش کا سوال آتا ھے تو اَس کے لئے بلگرام کا ایك درخشندہ اَلماس (عماد الملك) تجویز ھوتا ھے اور اسطرح یہ ,, قبائے خُسروانی ،، تیار ھوجاتی ھے یہ تھا وہ زمانہ جب جناب ھوش کے عنفوان شباب نے دکن میں آنکھ کھولی ۔ ایك طرف مہاراجہ بہادر مرحوم کی رنگین صحبتیں یکسر عبیر و گلال، یکسر شعر و نغمہ یکسر حُسن وشباب! اور دوسری طرف نواب عماد الملك کی تربیت یکسر صلاح و تقوی ، یکسر حکمت و فلسفہ ، یکسر متانت و سنجیدگی !

رات کی تمام وہ سرشاریاں جنھیں ہوش "مہاراجہ بہادر" کے یہاں سے لاتے تھے صبح کو "عماد الملک" کے پاس پہنچکر محو ہو جاتی تھیں اور جب وہ دن کو یہاں کے "صلاح کار" سے گھبرا اٹھتے تھے تو پھر رات کو وھیں "منِ خراب" کی صحبت میں پہنچ جاتے تھے الغرض بقول غالب ,, رات کو مئے پینا" اور صبح کو زمزم پر جامۂ احرام کے دھبّے" دھونا" یہ تھا معمول ہوش کی زندگی کا جو حیدرآباد میں بسر ھوئی اور جسکے وہ رفتہ رفتہ اتنے خوگر ھو گئے کہ جبتک کوئی "نیش" نہ ھو وہ کسی "نوش" کا لُطف آٹھا ھی نہیں سکتے۔

یہ تھے وہ اسباب جنھوں نے ہوش کے ذوق میں یہ جامع اضداد کیفیت پیدا کردی اور ان کی ادبی زندگی کا یہی جزو لازم ھو کر رھگئی۔ اس مثنوی میں ہوش کی یہ انفرادیت و خصوصیت بہت نُمایاں ھے یعنی اصل قصہ کو دیکھئے تو اس میں وھی "شاد پیلس" والی رنگینی و حُسن کاری نظر آتی ھے لیکن نتیجہ کے لحاظ سے وہ "عماد الملک" کا فلسفۂ حیات ھے اور اس مثنوی سے اسی وقت پورا لُطف آٹھایا جاسکتا ھے جب آپ اس حقیقت کو سامنے رکھکر اس کا مطالعہ کریں۔

اس مثنوی کے تین رخ ھیں ایك وہ جسکا تعلق پلاٹ سے ھے دوسرا وہ جو فن سے تعلق رکھتا ھے اور تیسرا اصلی رخ وہ ھے جسے اس نظم کی غرض وغایت کہنا چاھئے۔

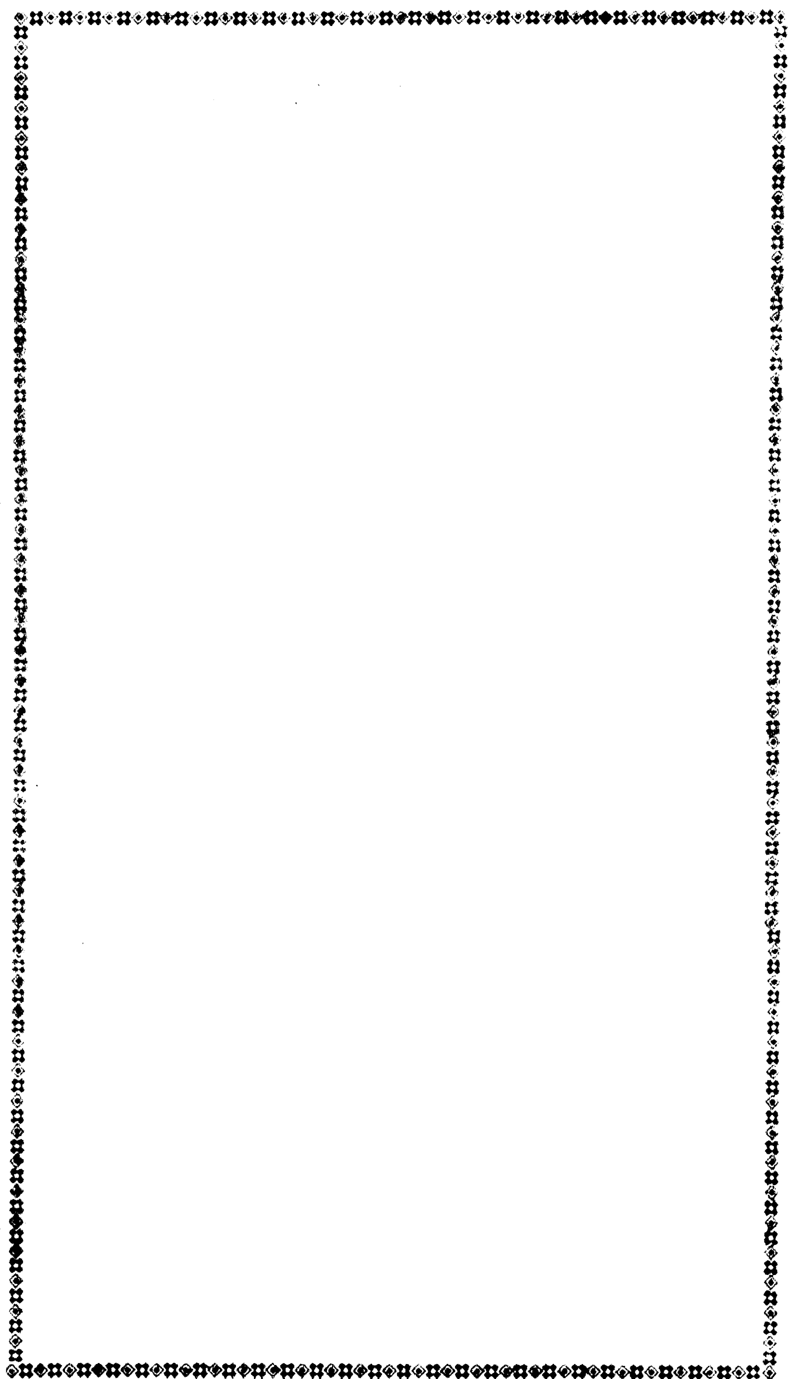
پلاٹ اس کا قریب قریب وھی ھے جو پُرانی مثنویوں میں پایا جاتا ھے اور اس کی وجہ غالباً یہ ھے کہ قصہ کا آغاز ساگر سے ہوتا ھے جہاں ھوش کی ابتدائی جوانی کا کچھ زمانہ بسر ھوا ھے اور کسی ایسے خاص واقعہ کی یادگار ھے جو بغیر اس نوع کے پلاٹ کے ھوش کی " رومانیت پسند " طبیعت کے لئے باعث تسکین نہ ہوسکتا تھا۔

فنی حیثیت سے غالباً اتنا کہنا کافی ھوگا کہ پوری مثنوی پڑھنے کے بعد کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ کسی پختہ کار مشاق ماہر فن کا کلام نہیں ھے رھا تیسرا رُخ سو وھی بہت اھم ھے اور اس رُخ کی جھلك مثنوی کے ھر سین اور ھر مکالمہ مین اتنی فراوانی کے ساتھ پائی جاتی ھے کہ اگر ھم مثنوی کے " واقعاتی " اشعار کو نکالدیں تو بھی نصف سے زیادہ حصہ ایسا رہ جائیگا جسکو بلا تکلّف " مدرسۃ الواعظین " کے نصاب میں شامل کیا جاسکتا ھے۔

میں فسانہ یا پلاٹ کا خلاصہ بیان کرنا مناسب نہیں سمجھتا کیونکہ مثنوی کے مطالعہ کا لُطف اس سے کم ہوجائیگا اور نہ اس کے فنی محاسن کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں کیونکہ وہ جا بجا اتنے بکھرے ہوئے ہیں کہ نہ ان کو میں سمیٹ سکتا ہوں اور نہ وجدان انکی وضاحت سے مُطمئن ہوسکتا ہے رہا مثنوی کا وہ رُخ جو میرے نزدیک سب سے زیادہ اہم ہے سو اسکے متعلق میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہنا چاہتا کہ اخلاق و مذہب کی صحیح مگر خشک تعلیم کو ہوش نے اسقدر دلکش پیرایہ میں بیان کیا ہے کہ اگر ہمارے علماء بھی وعظ و پند کے لئے یہی انداز اختیار کرلیں تو چند دن میں سوائے ,,اعمال خیر،، کے یہاں کچھ نظر نہ آئے اور دنیا رہنے کے قابل نہ رہے!

اب آپ اس مثنوی کا مطالعہ شروع کیجئے اور دعا دیجئے اس ہستی کو جس نے ہوش کو اس کی اشاعت پر مجبور کیا اور زمانہ کو بالکل اقتضاء زمانہ کے مطابق ایک چیز میسر آئی فقط

لکھنو ۵۔ مارچ سنہ ۱۹۴۵ع | نیاز فتحپوری



بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

-----*-----

بنامِ خُدائے کمال آفریں
جلیل و جمیل و جمال آفریں
حدوں سے تصوّر کی باہر ہے وہ
قیاساتِ عالم سے برتر ہے وہ
یہ ایوانِ امکاں ہے جسکی نمود
بہرحال واجب ہے جسکا وجود
یہ ربطِ عناصر ہے اس کی دلیل
کہ وہ نظمِ عالم کا ہے خود کفیل
یہ رنگینئ وسعتِ آب و رنگ
یہ رعنائی صورتِ آب و رنگ
سحر کی یہ رونق یہ شب کا سکوت
اُسی کی خدائی کے ہیں یہ ثبوت
محیطِ فضا تابشِ مہر و ماہ
اُسی اک حقیقت کے سب ہیں گواہ
یہ چھایا ہوا نیلگوں سائباں
یہ ہنستے ہوے انجمِ ضو فشاں

حدودِ نگاہ و خطوطِ شفق
زمیں کی تہیں آسماں کے طبق
دل آویز یہ جلوۂ صبح و شام
اُسی کا ھے شاھد یہ سارا نظام
زمان و مکاں کا ھے خالق وھی
وُھی حرفِ آخر ھے سابق وھی
اُسی نے کیا پردۂ غیب چاک
امینِ ازل ھوگئی مُشتِ خاک
وھی رازدانِ حُدوث و قِدم
وھی عارفِ رمزِ لوح و قلم
اُسی کا عطیہ ھیں دل اور دماغ
ضیا پاش فکر و نظر کے چراغ
اُسی کو بقا ھے اُسی کو دوام
اُسی کا ھے جلوہ یہ حُسنِ تمام
وہ ھستی ھے اک ھستیٔ بیکراں
وہ ھے بے نیازِ مکان و زماں
یہ حدبندیاں ھیں خلافِ اصول
کرے گی نہ توحید اِن کو قبول

زماں ومکاں ہیں تعیّن کے جال
تعیّن میں ہے اس کا عِرفاں مُحال
جہاں در جہاں ہے اسی کا نظام
کیا خلق اپنے لئے ''کُل'' کا نام
وہ کُل ہے وہ کونین کو ہے مُحیط
عناصر کے سب زاویوں سے بَسیط
وہی ایک ہے مرکزِ کائنات
بنائے وجود و نمود و حیات
ہر اک جز و کُل پر ہے اسکا عمل
وہ ہے عِلّتِ ربط و ضبطِ عِلَل
وہ سرمایۂ ہستئ آب و گِل
وہ سرچشمۂ مستئ آب و گِل
یہ ساغر ہے اس کا پلایا ہوا
وہ ہے روحِ فطرت پہ چھایا ہوا



اسی نے بنائی محبت سی شئے
دھمک جس کی ہر نبضِ ہستی میں ہے

محبت سے ہے انس و جاں کا ظہور
محبت سے کون و مکاں کا ظہور
محبت بہار و خزاں کی نمود
محبت سے جانِ جہاں کی نمود
ازل میں تھی اک سمت سب کائنات
بہ تمکینِ ذات و بحُسنِ صفات
جہاں بانیاں تاج و تخت و سپاہ
ہنرمندیاں مسندِ عز و جاہ
محبت تھی سمتِ دگر ضوفشاں
بظاہر سُبُک اور بباطن گراں
جبیں اِس طرف آشنائے غرور
ادھر ایک ہلکا سا کیف و سرور
بس اب دیر تدبیر منزل کی تھی
محبت کو اب آرزو دل کی تھی
سو دل بھی محبت سے گھُل مِل گیا
بہار آفریں اک چمن کھِل گیا
محبت ہوئی دہر کی حکمراں
زمیں تو زمیں جُھک گیا آسماں

سُبُک وزنِ کون و مکاں ہوگیا
محبت کا پلّہ گراں ہوگیا
یہیں سے دماغوں نے پایا سُراغ
کہ ہے دل نشین کیوں محبت کا داغ
محبت ہے جوہر زمانہ عَرَض
محبت ہی تخلیق کی ہے غرض
عجب اِس کی فطرت کا انداز ہے
کہیں سوز ہے یہ کہیں ساز ہے
کسی دل میں غم ہے کسی میں نشاط
کہیں کار فرما کہیں بے بساط
تبسم کہیں ہے کہیں زہر خند
کہیں وجہ درد اور کہیں درد مند
کہیں ہوگئی خود شہید وفا
کہیں اِس کو دینا پڑا خوں بہا
نرالے ہیں اِس کے بلند اور پست
کہیں بندۂ در کہیں خود پرست
کہیں راہزن ہے کہیں راہبر
کبھی پردہ آرا کبھی پردہ در

سراپا کبھی راز ھی راز ھے

کبھی رازِ ھستی کی غمّاز ھے

کہیں ھے حقیقت کہیں ھے مجاز

کہیں عجز ھے اور کہیں ھے یہ ناز

کہیں گُل بدامن ھے مثلِ بہار

کہیں صورتِ برق ھے شعلہ بار

رگِ جاں کبھی ھے کبھی نیشتر

کہیں نغمہ زن ھے کہیں نوحہ گر

نمائندهٔ دین و ایماں کہیں

کہیں برھمن ھے مسلماں کہیں

یہاں اور ھے یہ وھاں اور ھے

زمیں اِس کی اور آسماں اور ھے

مزے اِسکے تقدیر والوں سے پوچھ

غمِ عشق کے پائمالوں سے پوچھ

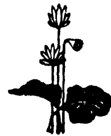
محبت میں دونوں جہاں کھو دئے

کبھی یاد کچھ آگیا رو دئے

یہ آنکھیں جو ہیں ڈبڈبائی ہوئی
شبِ غم کی ہیں رنگ لائی ہوئی
یہ ہم سے بھی سرزد ہوا ہے گُناہ
محبت سے برسوں کی ہے رسم وراہ
وفاؤں کا دیکر سہارا ہمیں
کسی کی نگاہوں نے مارا ہمیں
ابھی کچھ تو پہلو بدلتا ہے دل
کوئی جیسے چُٹکی سے مَلتا ہے دل
اِس اندازِ غم پر دعا ہے یہی
تڑپتی ہوئی التجا ہے یہی
خدایا ہمیں ہمّتِ عشق دے
غمِ شوق دے لذّتِ عشق دے
بنا دل کو اب اِسقدر بےقرار
بھڑک آٹھیں جسکی تڑپ سے شرار
جو دل حُسن کا محرمِ راز ہے
خدا کی قسم قابلِ ناز ہے
غم دل میں یارب لطافت بھی دے
محبت جودی ہے مودّت بھی دے

مودّت جو روحِ عبادت بھی ہو
مودت جو "اجرِ رسالتؐ" بھی ہو
مودّت سکھائے جو "خُلقِ حسنؑ"
نمایاں ہوں جس میں "حسینیؑ" چلن
مودّت جو شرح عزائم کرے
صداقت کو سر دیکے قائم کرے
مودّت جو "بُوذَر" کو حاصل ہوئی
جو "سلمان" کی شمع محفل ہوئی
مودّت نکالے جو اوہام سے
چُھڑائے جو باطل کے اصنام سے
مودّت جو آسائشِ دل بنے
جو بُنیادِ انسانِ کامل بنے
مودّت جو حق کی مخالف نہ ہو
جو باطل کی یورش سے خائف نہ ہو
مودّت جو مشکل میں نکھرے کچھ اور
جو آسان کردے مصیبت کا دور
مودّت جو بے عزمِ مُحکم نہ ہو
حوادِث میں جسکی جبیں خم نہ ہو

مودّت جو روحوں پہ چھا کر رہے
جو خود اعتمادی جگا کر رہے
مودّت جو فرمانروائی کرے
سرِ آب وگِل جو خُدائی کرے
مودّت جو غم سے بہلتی رہے
حقیقت کے سایہ میں پلتی رہے
مودّت جو ہو قوم کی چارہ ساز
غریبوں کی خدمت پہ ہو جسکو ناز
مودّت جو سمجھائے رازِ حیات
نہاں جسکی مُٹّھی میں ہو کائنات
حقیقت سے اب آشنا کر مجھے
الٰہی مودّت عطا کر مجھے



نظر سے نظر اب ملا ساقیا
فلک سے جو آتری ہے لا ساقیا
پلا دیدہٗ و دل کی سینچی ہوئی
پلا اب دعاؤں کی کھینچی ہوئی
کرم کے وہ جذبے کہاں سو گئے
یہ دستِ دعا ظرف بھی ہو گئے
ان آنکھوں میں نشہ کا گھر چاہئے
اندھیرا ہے نورِ نظر چاہئے
جوانی کی پھر بے خودی ڈھونڈہ لوں
کوئی وارثِ میکشی ڈھونڈہ لوں
مجھے چاہئیں نَو بنَو جام آج
غرورِ سحر ہو مری شام آج
بس اتنا ہو ذوقِ طلب کا مآل
خوشی کا عروج اور غم کا زوال
مجھے پھر بنا دے فرشتہ صفت
چھلکتی ہو ساغر سے معصومیت
گُناہوں کی دنیا پہ چھا جاؤں میں
نگاہوں سے پردے آٹھا جاؤں میں

نیا کیفِ باطن کا انداز ہو
حقیقت عیاں ہو کے بھی راز ہو
مری نغمہ کاری ہو نئے کی طرح
میں لوں کروٹیں موجِ مئے کی طرح
وہ ساگر کا منظر کُھلا سامنے
عجب کیف بخشا ترے جام نے
وہ ساگر کہ اجڑی سی بستی ہے آج
کبھی "آلہا اودل" کا تھا جسمیں راج
جہاں نام سے اُن کے ہے اک گڑھی
ابھی تک ہے سب کی نظر پر چڑھی
یہاں ایک تھا تاجرِ ذی وقار
جہاندیدہ و عاقل و ہوشیار
سرافراز تھا اس کا مشہور نام
وہاں اسکے گرویدہ تھے خاص و عام
تجارت میں حاصل تھا ایسا شعور
جواب اسکا ملتا نہ تھا دور دور
ملا تھا اسے قلب درد آشنا
وہ تھا اہلِ حاجت کا حاجت روا

غریبوں کی دل میں محبت بھی تھی
فقیروں سے اُسکو اِرادت بھی تھی
خوش اخلاق بھی بات کا بھی دھنی
سخی ھاتھ کا اور دل کا غنی
وہ اُس شہر میں تھا بہت نیکنام
خدا نے کیا تھا اُسے شاد کام
وہ فکرِ معیشت سے آزاد تھا
اگر تھا تو اک رنجِ اولاد تھا
اِسی غم میں گزرے جوانی کے دن
قریب آ گیا بڑھ کے پیری کا سِن
خبر دے رھے تھے یہ موئے سپید
کہ اب جھلملاتی ھے شمع امید
مشیّت پہ تھی صبر کرنے کی خو
چھپائے رہا دل میں یہ آرزو
بالآخر ھوا فضلِ ربّ قدیر
ملا اُس کو اک برگزیدہ فقیر
غریبوں کی صورت فقیروں کا بھیس
خدا کی ھر اک سرزمیں جسکا دیس

نگاھوں میں پنہاں طریقت کے راز
خد و خال آئینۂ سوز و ساز
کمالِ ریاضت سے روشن ضمیر
بباطن غنی اور بظاھر فقیر
جبیں کی بلندی جو تھی دلنواز
تو کچھ خود بخود جُھک گیا سرفراز
پھر اُس نے یہ سوچا کہ خدمت کرے
کچھ اِس طرح کسبِ سعادت کرے
ادب سے نگاھیں وہ نیچی کئے
بڑھا اُس طرف بند مُٹھی کئے
یہ کہنے لگا ھنس کے وہ خوش سیر
طلب گار ھیں زر کے دریُوزہ گر
مجھے مالِ دنیا کی حاجت نہیں
فقیروں کو اِس کی ضرورت نہیں
یہ مال اپنی اولاد پر خرچ کر
کہ وہ ھیں تری زندگی کے ثمر
ھرا تیرا باغِ تمنا رھے
ترا نام دنیا میں زندہ رھے

یہ سُنتے ہی خنجر سا دل پر لگا
کہ دُکھتی ہوئی رگ پہ نشتر لگا
ہوئے آنکھ سے اشک حسرت رواں
گریں خرمنِ صبر پر بجلیاں
نئے غم کے پہلو نکلنے لگے
وہ بُجھتے ہوئے داغ جلنے لگے
برسنے لگیں رُخ پہ بےتابیاں
کلیجہ میں لیں درد نے چُٹکیاں
نظر اسکو آیا جو یہ اضطراب
تو بولا وہ پیرِ تقدّس مآب
یکایک ہوا کیوں ترا حال غیر
ترے دین و دنیا ہیں دونوں بخیر
ہراساں نہ ہو اے گرفتارِ غم
کریگا خدا اپنا فضل و کرم
تمنا ترے دل کی بر لائے گا
وہی مشکل آسان فرمائے گا
نہ ہو آس سے مایوس بندہ کبھی
کہ ہے ذاتِ واجب رحیم و غنی

صدف کو دیا اُس نے دُرِّ یتیم
اُسی نے بسائی گلوں میں شمیم
اُسی نے چمن کو عطا کی بہار
شگوفوں کو اُس نے کیا عطر بار
اُسی نے حجر کو شرارے دئیے
جبینِ فلک کو ستارے دئیے
اُسی نے سجی آسماں کی بساط
کواکب میں پیدا کیا اِرتباط
سرافراز یوں مہرباں دیکھکر
مخاطب ہوا اُس سے با چشمِ تر
کہ اے عیسئ وقت روشن ضمیر
نہیں ہے مرا درد درماں پذیر
سُناؤں کسے داستانِ الم
کہ دل ہے مرا اک جہانِ الم
میسر ہیں سامانِ راحت مجھے
بظاہر نہیں کوئی حاجت مجھے
مگر رنجِ اولاد ہے جاں گُسل
تمنائے دل بند رکھتا ہے دل

بہت رُوح فرسا ہے غم کی خراش
نظر کو ھے نورِ نظر کی تلاش
فروزاں ھو جس سے یہ روزِ سیاہ
ترستی ھے اُس روشنی کو نگاہ
جو نخلِ تمنا نہ ھو بارور
تو مٹی سے بدتر ھین لعل و گُہر
کہا اُس نے ھنسکر یہ سچ ھے مگر
وہ ھے خالقِ آب و گِل بحر و بر
کرشمے ھیں اُسکے خوشی اور ملال
وہ لاریب ھے قادرِ ذُوالجلال
یہ غم بھی خوشی میں بدل جائیگا
ترے دل کا کانٹا نکل جائیگا
کوئی وسوسہ دل میں آنے نہ پائے
یقیں کامیابی کا جانے نہ پائے
میں کہتا ھوں جو وہ ذرا کرکے دیکھ
دوا کرچکا اب دعا کرکے دیکھ
دعا پردۂ غیب کرتی ھے چاک
دعا ھی سے اکسیر بنتی ھے خاک

سرافراز نے جب سنا یہ بیان
مٹا دل سے ہر نقشِ وہم و گماں
طلب میں ریاضت کی شان آ گئی
تمنائے مردہ میں جان آ گئی
یقینِ کرم سے ہوا بہرہ ور
زباں کو دیا جوشِ دل نے اثر
سراغِ قبولِ دعا مل گیا
امیدوں کو پھر آسرا مل گیا
خلوصِ ارادت کا منظر کُھلا
نگاہوں کے آگے نیا در کُھلا
وہ در جس پہ رکھکر جبینِ نیاز
کیا ھے رسولوںؐ نے بھی فخر و ناز
وہ در جسکے ذرّے بھی ھیں آفتاب
جہاں سرمدی نور ھے بے نقاب
وہ در جس سے ھے رحمتوں کا نزول
وہ در نام ھے جس کا حُسنِ قبول
وہ در مل گیا اور جبیں جھک گئی
زباں بن گیا دل زباں رُک گئی

دعاؤں نے آخر دکھایا اثر
نہالِ تمنا ہوا بارور



اُٹھایا جو شب نے حجابِ سیاہ
ملا صبح ہی صبح نورِ نگاہ
نئی شکل دورِ زماں ہوگئی
زمیں یک بیک آسماں ہوگئی
خوشی کا در و بام پر نور تھا
جسے دیکھئے شاد و مسرور تھا
خدا نے دیا اُس کو ایسا پسر
کہ جسکی ولادت سے روشن تھا گھر
نئی زندگی کی سحر آگئی
سحر عید کی اُس کے گھر آگئی
سر افراز نے پا کے نورِ نظر
جھکایا پئے سجدۂ شکر سر
خدا سے یہ کی عرض با صد نیاز
کہ اے عالم الغیب اے کارساز

تاثیر دعا

تُجھی سے ھے آرائشِ آب و گِل
تُجھی سے ھے آسائشِ جان و دل
ترا حُکم تخلیقِ عالم کا راز
ترا لُطف سرمایۂ اِمتیاز
ھر اك چیز کو ھے سہارا ترا
ھوا دیکھتی ھے اِشارا ترا
نہ جب تك دیا تو نے اذنِ خرام
فَضا میں نہ تھا ابر و باراں کا نام
ترے حکم کے منتظر برق و باد
ترے فیض سے خُشك و تر با مراد
اِدھر تھی صدف اُس طرف تھا چمن
یہ صَرفِ خزاں اور وہ تشنہ دھن
شگوفے اِسے اُس کو گوھر ملا
ملا اور تمنا سے بڑھ کر ملا
مٹایا مرے دل سے احساسِ غم
کہاں مجھ سے ممکن سپاسِ کرم
یہ بندہ نوازی ھے جب اسے خدا
اِسے زندگی بھی ھو ایسی عطا

کہ دنیا و دیں میں نمایاں رہے
ترا فضل اِس کا نگہبان رہے
اُٹھا کر غرض اُس نے سجدہ سے سر
غریبوں کو خیرات دی بیشتر
سکونِ فکرِ بے تاب پانے لگی
کہ گاڑھی کمائی ٹھکانے لگی
سب اُس کی ولادت سے تھے شادکام
تو رکھا گیا "کامراں" اُس کا نام
پلک مارتے کٹ گئے ماہ و سال
نکھرنے لگے عمر کے خدّ و خال
مکمل یہ جب ہوچکا اہتمام
ہوا اُس کی تعلیم کا انتظام
بڑے قابل افراد رکھے گئے
ہر اک فن کے اُستاد رکھے گئے
کہ علم و عمل سے ہو یوں بہرہ یاب
نہ ہو عصرِ حاضر میں جس کا جواب
ذہانت کا شُہرہ ہو آفاق میں
مکمل ہو تہذیب و اخلاق میں

نقشِ منظر

رھیں بزمِ ھستی میں آس کے ندیم
علومِ جدید و علومِ قدیم
مکاں خوش قطع اك بنایا گیا
بعنوانِ مکتب سجایا گیا
غرض ھوچکا جب یہ سب اھتمام
ھوئی تسمیہ خوانی کی دھوم دھام
ملا تھا جو ذھنِ خداداد آسے
تو محنت کی ملنے لگی داد آسے
بڑھا سِن تو شوق اور بڑھتا رھا
ترقی کے زینہ پہ چڑھتا رھا
نمایاں ھوئی اب نئی آب و تاب
خط و خال میں مُسکرایا شباب
نئی درسگاھوں میں داخل ھوا
وہ پڑھ لکھ کے اك فردِ قابل ھوا
سرافراز نے دل میں یہ سوچ کر
کہ گھر میں رھے اپنے گھر کا ھُنر
اب اِس راستہ پر لگایا آسے
تجارت کا گُر بھی سکھایا آسے

طبیعت میں تھا ایک فطری شعور
ھوا جلد اس فن پہ کامل عبور
ذھانت سے اس کی تجارت بڑھی
تجارت کی حکمت سے دولت بڑھی
ھوا جسقدر واقف کار و بار
بڑھا اور دنیا میں اس کا وقار
ھوا اس کی سیرت کا شہرہ جو عام
زبانوں پہ آنے لگا اس کا نام
غریب اسکے مسرور بندوں میں تھے
امیر اسکے احسان مندوں میں تھے
وہ راحت رساں خاندانوں کا تھا
سہارا بہت سے گھرانوں کا تھا
محبت کا مسلک بھلائی سے کام
یہی شغل تھا رات دن صبح و شام
نظر میں کشش گفتگو دل پذیر
زمانہ تھا لطفِ سخن کا اسیر
اسے شان و شوکت سے رغبت نہ تھی
کہیں نام کو بھی رعونت نہ تھی

پرستارِ تنظیم و تدبیر تھا
جواں تھا مگر عقل میں پیر تھا
نہ سرگشتۂ جادۂ خود سری
نہ وارفتۂ شیوۂ دلبری
جنوں خیز تھی گو ھوائے شباب
نہ ساقی کی حسرت نہ ذوقِ شراب
نہ منزل سے دور اور نہ گم کردہ راہ
نہ بیگانۂ حُسنِ باطن نگاہ
کبھی شاھد و مئے کا خواھاں نہ تھا
وہ کمزور فطرت کا انساں نہ تھا
بہت معتدل تھا طبیعت کا رنگ
بہت خوب تھا اُسکی سیرت کا رنگ
طبیعت میں خود داریاں تھیں ضرور
مگر تھا نہ اُس تہہ میں پنہاں غرور
نمایاں تھی پوشاک میں سادگی
روش اُس نے اپنی نہ چھوڑی کبھی
وہ انداز اُسکے وہ حُسنِ بیاں
بزرگوں کا جن سے چلن تھا عیاں

کبھی اپنی حد سے گزرتا نہ تھا
کبھی غیر کی ریس کرتا نہ تھا
تجارت میں تھیں اُس کی دلچسپیاں
یہی چیز تھی اُسکی روحِ رواں
اِسی میں تھی خواہش اُسے نام کی
نشانی سمجھتا تھا اسلام کی

جوانی تھی اور جوش زن تھا لہو
نئے کام کی روز تھی جستجو
خمیر اُس کا تھا ہند کی خاک سے
حجازی تھے دل کے مگر ولولے
بہ حُسنِ تمنا بہ ذوقِ نیاز
بہت اُس کو تھا اشتیاقِ حجاز
اِسی طرح تھا اُس کو یہ بھی خیال
کہ دیکھے وہ مغرب کی شانِ کمال
مگر یہ بھی کھٹکا تھا دل میں نہاں
کہ فرقت نہ ہو باپ ماں پر گراں

کبھی اِس تردّد میں تھا جی نڈھال
یہ سُن کر پدر کا نہ ہو غیر حال
کبھی اِس تصوّر سے تھا مضمحل
کہ ہوتا ہے نازک بہت ماں کا دل
اِسی سوچ میں وقت کٹتا رہا
بڑھی بیکلی صبر گھٹتا رہا
ہوئی کوششِ ضبط جب رائیگاں
سوا ہوگئیں اور بے تابیاں
تو دل میں لئے حسرت و یاس وہ
گیا ایک دن باپ کے پاس وہ
مگر مدعا لب پہ آتا نہ تھا
ادب اُس کی ہمّت بڑھاتا نہ تھا
بہت دیر خاموش بیٹھا رہا
نگاہوں نے کیا جانئے کیا کہا
کہ خود ہی مخاطب ہوا سرفراز
تو آخر کُھلا اِس خموشی کا راز
کیا اِسطرح اُس نے اظہارِ حال
کہ مجھکو ہے سیر و سفر کا خیال

مسلماں کا مرکز ہے ارضِ حجاز
اسے تو بہر حال ہے امتیاز
اگر ساتھ دے جائیں میرے نصیب
تو پہلے ہے عزمِ دیارِ حبیب
اسی ضمن میں ہے یہ مدِّ نظر
کہ حاصل ہوں کچھ تجرباتِ سفر
مرے دل کو ہے اس کا پورا یقیں
کہ آپ اس ارادے میں حائل نہیں
مگر مجھکو روکیں گی اَمّی ضرور
کرینگی وہ کیونکر نگاہوں سے دُور
وہ ماں ہیں انہیں ہے محبت سے کام
وہاں کون لے گا سمندر کا نام
وہ ہرگز اجازت نہ دینگی مجھے
خوشی سے تو رخصت نہ دینگی مجھے
توجہ اگر آپ فرمائینگے
زمانے کے حالات سمجھائینگے
تو مشکل یہ آسان ہو جائیگی
یہ امیدِ موہوم بر آئیگی

وہ کتنا بھی ہو کوئی روشن خیال
مگر پھر بھی اولاد کا تھا سوال
سرافراز سا مرد گھبرا گیا
یہ سُن کر جبیں پر عرق آ گیا
تردّد کا بادل سا گھرنے لگا
نگاھوں میں وہ عہد پھرنے لگا
وہ اولاد سے جب کہ تھا نا اُمید
نہ دیکھا تھا جب تک یہ روزِ سعید
وہ ہر نوش میں تلخیاں نیش کی
یکایک ملاقات درویش کی
وہ لختِ جگر کی ولادت کا دن
وہ دنیا میں پہلا مسرت کا دن
وہ تعلیم اور تربیت کا نظام
سحر بچپنے کی جوانی کی شام
تصوّر یہ پردے اُٹھانے لگا
وہ بیٹے سے آنکھیں چُرانے لگا
یہ سوچا جو انجام ہونا صواب
تو کیا دو نگاہیں اُسکی ماں کو جواب

نہیں عالم الغیب نوعِ بشر
کسے ساعتِ نیک و بد کی خبر
کریگا وہاں کون یوں دیکھ بھال
سفر ہے خدا جانے کیا ہو مآل
اِدھر دل کو اسکی جدائی تھی شاق
گوارا نہ تھا دو گھڑی کا فراق
پھر اُسپر یہ اندیشہ تھا جاں گُسل
کہ میلا کہیں ہو نہ بیٹے کا دل
ہوئی خوب عقل و محبت میں جنگ
رہا جم کے آخر محبت کا رنگ
محبت کا فرماں ٹلا ہے کہیں
کسی کا یہاں بس چلا ہے کہیں
رُخِ کامراں تھا جو اترا ہوا
تو ناچار اس کو یہ کہنا پڑا
جہاں تک ہے تکمیلِ حج کا سوال
کسی کو نہیں کوئی وجہ ملال
مبارک ہے قصدِ حجاز و عراق
زیارت کا پورا کرو اشتیاق

یہ عمر اور ایسا تمہارا خیال
اِسی سے تو کُھلتا ہے باطن کا حال
مگر سوئے مغرب یہ عزمِ سفر
ابھی سے ضروری نہیں اِسقدر
سنو کامران بات ایسی ہو صاف
کہ ماں کو تمہاری نہ ہو اختلاف
یہ مانا نکھرتی ہے اِس سے نظر
سفر ہے یقیناً دلیلِ ظفر
اگر سیر ہی تم کو منظور ہے
تو پھر کیا قریب اور کیا دُور ہے
یہی ملک دنیا سے کچھ کم نہیں
یہاں کون سی وضع عالم نہیں
یہیں پہلے ہو گامزن کارواں
کہ ہے قابلِ سیر ہندوستاں
مگر زحمتیں بھی ہیں اس میں ضرور
سمجھ سوچ لو تم ہو خود باشعور
کوئی سہل ہے کوئی منزل کڑی
مصیبت کا امکان ہے ہر گھڑی

بظاهر سفر میں ھیں دلچسپیاں
سمجھتے ھیں راحت اِسے نوجواں
مگر یہ مصیبت کا اک بھیس ھے
کہ پردیس آخر تو پردیس ھے
بہت اِسکی راھوں میں ھیں گرم و سرد
یہ کڑیاں جو سہ لے وہ انساں ھے مرد
یہاں سے تو آسان ھے انتظام
مگر اِسکے آگے تمہارا ھے کام
رھا والدہ کا تمہاری سوال
تقاضائے فطرت ھے اُن کا ملال
میں یہ ذکر کرتا ھوں اُن سے ابھی
خوشی سے تو راضی نہ ھونگی کبھی
وہ سُنتے ھی انکار کردینگی صاف
اُنہیں اس سے ھوگا ضرور اختلاف
مگر کہنے سُننے سے باز آئینگی
میں سمجھاؤنگا جب سمجھ جائینگی
یہ کہکر اُٹھا کچھ تامّل کے ساتھ
لیا ھاتھ میں کامراں کا بھی ھاتھ

چلا یوں سوئے مادرِ کامراں
خلش دل میں لب پر تبسّم عیاں
کہا اے شریک و رفیقِ حیات
انہیں عرض کرنی ہے آج ایک بات
بڑی آرزو لیکے یہ آئے ہیں
سفارش کی خاطر مجھے لائے ہیں
جوانی میں سب کا یہ ہوتا ہے رنگ
سیاحت کی ہے ان کے دل میں امنگ
ضروری بھی ہے سیرِ شہر و دیار
انہیں کو تو کرنا ہے اب کاروبار
سیاحت سے ہوتی ہے اونچی نظر
کہ یہ ہے بڑی حکمتِ کارگر
سیاحت ہدایت ہے قرآن کی
کہ آنکھ اس سے کُھلتی ہے انسان کی
جواں ہوچکے ہیں بہ فضلِ خدا
یہ اب گھر سے باہر بھی نکلیں ذرا
ذرا دیکھ لیں پہلے ہندوستاں
مناظر بہت دیدنی ہیں یہاں

عقیدت یہ اِس سِن میں ھے بے مثال
کہ حج و زیارت کا بھی ھے خیال
ھمارے ھی کچھ ایسے مقسوم ھیں
کہ ھم اس سعادت سے محروم ھیں
تجارت پہ تھا زندگی کا مدار
زیارت میں ھارج رھا کاروبار
یہ اِن کی ھے توفیق ان کا نصیب
کہ اَس سر زمیں پر ھو سجدہ نصیب
جو حج کے زمانے میں پہنچے آدھر
تو کیسا مبارک یہ ھوگا سفر
یہاں قدر کیا حق کے پیغام کی
وھاں شان دیکھیں گے اسلام کی
یہ دیکھیں گے ھر قوم کی زندگی
ملیں گے ھر اك ملك کے آدمی
مراکش کے ٹرکی کے ایران کے
فلسطین کے مصر و بلقان کے
نئی صورتِ فکر و ذھن و مزاج
خیالات وحالات و رسم و رواج

وہ آپس میں باتیں بھی کچھ کام کی
یہ ہے مصلحت حج میں اسلام کی
عرب کا ھی ٹکڑا ہے مُلک عراق
بجا ہے وہاں کا جو ہو اشتیاق
یہیں روحِ کونین ہے بیقرار
اسی جا ہے سبطِ نبیؐ کا مزار
زمیں ہے یہ وہ عرصۂ کیف و رنگ
ہوئی تھی جہاں حق سے باطل کی جنگ
جہاں اکثریت کو تھا فخر و ناز
مگر پھر بھی قلّتِ ہوئی سرفراز
صداقت کے آگے نہ ٹھرا دروغ
جہاں استقامت نے پایا فروغ
یہ آس در سے لیکر نگاہوں میں نور
کہیں جائیں دنیا میں نزدیک و دور
بُرائی کی حد میں نہ پھٹکیں گے یہ
کبھی راہ حق سے نہ بھٹکیں گے یہ
اگر سیرِ مغرب ہو مدّ نظر
اُدھر سے ہے یورپ بھی نزدیک تر

جہاں علم و حکمت کا ہے امتزاج
آسی جا ہے تہذیبِ حاضر کا راج
جہاں صنعتوں کی ہے تابندگی
نئے مسئلے ہیں نئی زندگی
نیا ہے جہاں اہلِ حرفت کا رنگ
وہی جانتے ہیں تجارت کے ڈھنگ
مگر چاہے جتنے بھی ہوں بیقرار
تمہاری اجازت پہ ہے انحصار
مرے دل کی پوچھو تو کہتا ہوں صاف
مجھے نام کو بھی نہیں اختلاف
جو تم بھی نہ سمجھو اسے ناروا
تو اِن کا سفر پر ہے جانا روا
سُنا کی سرافراز کا یہ بیاں
بڑے صبر سے مادرِ کامراں
مگر جب اجازت کا آیا سوال
ہوئے رُخ پہ ظاہر نشانِ ملال
نکھرنے لگی غم کی صورت گری
اُبھرنے لگی فطرتِ مادری

کہا سب تمہاری ھیں باتیں بجا
یہ دل ماں کا دل ھے کروں اِسکو کیا
سفر پھر سفر ھے وہ کچھ بھی سہی
نہ صاحب یہ مجھ سے نہو گا کبھی
نہیں میرے پہلو میں پتھر کا دل
کہاں سے میں لاؤں تمہارا سا دل
تمہیں کامیابی کا ہوگا یقیں
مگر میری تسکین ہوتی نہیں
زیارت کو جاتے ھیں یہ گر تو جائیں
ھے یہ شرط لیکن کہ واپس بھی آئیں
خدا جانے جی میں سمائی ھے کیا
کہ بیٹے سے کہتے ھیں پردیس جا
اکیلا رھیگا یہ کھایا نہ خوف
سمندر کی لہروں سے آیا نہ خوف
یہ ناپختہ کاری یہ لانبا سفر
تصوّر سے میرا تو پِھرتا ھے سر
مجھے یاد ھے جیسے کل کی سی بات
یہ ڈرتے تھے کتنے جب آتی تھی رات

جو بگڑے تو پھروں سنبھلتے نہ تھے
مری گود سے یہ نکلتے نہ تھے
طبیعت ہی اب دوسری ہوگئی
مَیں بھیگتے ہی نئی ہوگئی
زمانے کے ہیں سیکڑوں ہیر پھیر
بُرا وقت آتے نہیں ہوتی دیر
مجھے کوئی اِس بات کا دے جواب
بجا ہے کہ بیجا مرا اضطراب
مرے جی کو کیونکر قرار آئے گا
مری زندگی کا یہ ہیں آسرا
کہیں بال بیکا اگر ہوگیا
تو کوئی بتائے کرونگی میں کیا
کروں گی میں کسطرح رخصت انہیں
میں کس دل سے دونگی اجازت اِنہیں
اسی سے تو آئے نہیں میرے پاس
کہ میری طرف سے تھی خود اِنکو یاس
ارادہ جو تھا دل میں تم سے کہا
اُدھر تم نے اذنِ سفر دیدیا

آسے بھی تو ہوگی کوئی آرزو
چُسایا ہے جس ماں نے اپنا لہو
جو گہوارہ جُنباں رہی صبح و شام
ہوئی جسکی چھاتی پہ مشقِ خرام
جو مصروفِ خدمت تھی دن اور رات
غضب ہے کوئی آسکی پوچھے نہ بات
دکھاتا ہے کیا دیکھئے آسماں
نصیبوں کا لکھا مِٹا ہے کہاں
نظر آئی ماں یوں جو تصویرِ یاس
تو خود آڑ گئے "کامراں" کے حواس
وہ دل میں پشیمان ہونے لگا
نہ بن آئی جب کچھ تو رونے لگا
اِدھر دل گرفتہ سا تھا سرفراز
یہ محفل تھی اک عالمِ سوز و ساز
محبت ہوئی غم کی پھر چارہ گر
پڑی کامراں پر جو آسکی نظر
وہ عارض وہ اشکوں کا سیلِ رواں
یہ منظر کہاں دیکھ سکتی ہے ماں

نہ سمجھا گیا کچھ نہ سوچا گیا
گئی فکرِ انجام ہوش آگیا
ذرا اور آگے بلایا اُسے
کلیجہ سے اپنے لگایا اُسے
یہ کہنے لگی تم پہ قربان ماں
خدا تم کو رکھے سدا شادماں
تمہاری میں دشمن نہیں زینہار
تمہارے ہی دم سے ہے ساری بہار
پریشان اِس طرح ہوتے نہیں
میں قربان یوں مرد روتے نہیں
انوکھا سا تھا کچھ سفر کا خیال
مرے وہم میں تھا نہ ایسا خیال
میں یہ سُن کے حیران سی رہ گئی
خدا جانے اس رَو میں کیا کہہ گئی
تمہاری خوشی ہے اسی میں اگر
تو دیتی ہوں لو میں بھی اذنِ سفر
ضمانت میں حق کی دیا جائیے
خدا کے حوالے کیا جائیے

سرافراز کو جب سہارا ملا
اِدھر سے جو اتنا اشارا ملا
پسر سے کہا کیوں نہ کہتا تھا میں
نتیجہ وہی ہے جو سمجھا تھا میں
یہ پھر ہنس کے بیگم سے اُس نے کہا
کہو اب ہے میرا قصور اِس میں کیا
اِسی شان سے آئے تھے میرے پاس
اِسی طرح تھا اِن کا چہرہ اداس
کہاں تک اثر دل پہ لیتا نہ میں
اجازت اِنہیں کیسے دیتا نہ میں
غرض جب اجازت اُسے مل گئی
مسرت سے دل کی کلی کھِل گئی



اہتمامِ سفر

جو ہونے لگا اہتمامِ سفر
بنایا گیا اک نظامِ سفر
تعیّن ہوا پہلے تاریخ کا
اِسی طرح پھر اور ساماں ہوا
ملازم بھی دو اک ہوئے انتخاب
جو سیر و سفر میں رہیں ہمرکاب
ضروری ہر اک شئے فراہم ہوئی
سکوں آشنا فکرِ برہم ہوئی
غرض وقت یوں ہی گزرتا گیا
یہاں تک کہ رخصت کا دن آ گیا
سنبھالا تو ماں نے بہت اپنا دل
فراقِ پسر تھا مگر جان گُسِل
دھواں دیدہ و دل پہ چھانے لگا
لرزنے لگی غش سا آنے لگا
یہ عالم جو دیکھا سر افراز نے
پریشاں کیا غم کے انداز نے
وہ اپنی جگہ خود بھی تھا مُضمحِل
تڑپتا تھا سینے میں رہ رہ کے دل

نزاکت مگر وقت کی دیکھ کر
کہا تم ہو بے چین کیوں اِس قدر
یہ مانا غمِ ہجر ہے ناگوار
یہ مانا جدائی سے ہو بیقرار
یہ کیا حال ہے کس طرف دھیان ہے
مسافر کا خالق نگہبان ہے
خدا دے جسے مستقل عزم ورائے
تعجب ہے صبر اسکے دل کو نہ آئے
دعا دولت و کامرانی کی دو
نوید اب انہیں شادمانی کی دو
دعائیں یہ لیکر اگر جائیں گے
خدا چاہے تو بامراد آئیں گے
غرض ہو کے رخصت وہاں سے چلا
سوئے درزنانے مکاں سے چلا
سرافراز کے در پہ تھا اک ہُجوم
کہ تھی شہر بھر میں خبر بالعمُوم
چلا درس ہمت کا دیتا ہوا
دعائیں وہ اِن سب کی لیتا ہوا

نہاں تھا جو سینے میں سوز و گداز
یہ رُک رُک کے کہنے لگا سرفراز
اگرچہ ہو تم عاقل و ہوشیار
زمانے کی چالیں بھی ہیں بےشمار
بہت معرکے ہوں میں جھیلے ہوئے
بہت کھیل ایسے ہین کھیلے ہوئے
تمہیں دیکھنا ہے زمانا ابھی
زمانہ کو ہے آزمانا ابھی
ہر اک راہ سے ہے گزرنا تمہیں
سفر بحر و بر کا ہے کرنا تمہیں
رہے دل نشیں یہ حقیقت ذرا
کہ ہمّت کا ساتھی ہے فضلِ خدا
اگر عزم و ہمّت میں فرق آئیگا
تو ہر عیش غم سے بدل جائیگا
پڑے ہر قدم پر مکرّر نگاہ
کہ دھوکا نہ دیدے بھٹک کر نگاہ
تمہیں سیرِ یورپ کا بھی ہے خیال
وہاں بھی کرو جا کے تم دیکھ بھال

وہاں جا کے دیکھو تجارت کی شان
تجارت کی صنعت کی حرفت کی شان
نظر آئیں گے تم کو ہر گام پر
بہت صاحبِ علم و اہلِ ہنر
وہاں فکر نو میں ہیں روز اہلِ فن
نئی زندگی ہے نئے پیرہن
بڑے حوصلے ہیں بڑے کاروبار
تجارت پہ ہے زندگی کا مدار
تمہیں کارخانے ملیں گے بہت
طلسمی خزانے ملیں گے بہت
وہاں جن مشینوں سے ہوتا ہے کام
یہاں گوش زد ہیں فقط اُن کے نام
اُنہیں غور سے جا کے دیکھو وہاں
کہ ظاہر ہوں صنعت کے رازِ نہاں
وہ انسان ہیں پابند وقت اسقدر
کہ ہر کام ہوتا ہے اک وقت پر
وہاں عقل و دانش ہیں بر روئے کار
دماغوں کو سائنس ہے سازگار

یہ سائنس قدرت کا اک راز ہے
نہ جادو ہے کوئی نہ اعجاز ہے
کیا اِس نے محکم جہاں کا نظام
ہے سائنس ,,عقلِ منظّم،، کا نام
ہوئی اِس سے روشن جبینِ حیات
مُرتّب ہوئی دانشِ کائنات
نظر نکتہ رس ہمتیں ہیں بلند
وہ آسائشِ دل سے ہیں بہرہ مند
وہ اَسرارِ ہستی سے ہیں باخبر
وہ چھانے ہوے ہیں بہت بحر وبَر
وہاں طرزِ تعلیم بھی دیکھنا
مدارس کی تنظیم بھی دیکھنا
یہ حالات سب دیکھنا تم ضرور
مگر یہ حقیقت نہ ہو دل سے دور
کہ انساں جو دنیا میں ہیں باخبر
خدا نے جنہیں دی ہے گہری نظر
تمدّن سے وہ اپنے پھِرتے نہیں
وہ اوہامِ باطل میں گھِرتے نہیں

وہ اپنی حدوں سے گزرتے نہیں
وہ کورانہ تقلید کرتے نہیں
ہماری ہے اک مستقل زندگی
کبھی جس سے دنیا میں تھی روشنی
ہمارا تمدّن ہے مانا ہوا
حقائق کے دامن میں چھانا ہوا
یہ اَقصائے مشرق کی تہذیب بھی
معارف کے پھولوں سے مہکی ہوئی
زمانے پہ صدیوں سے ہے حکمراں
مٹے ہیں نہ جسکے مٹیں گے نشاں
اِسے یاد رکھنا یہ ہے اور بات
سنورتی ہے اِسطرح زُلفِ حیات
کوئی راہ چلتے بھی خُوبی ملے
تو انسان اُسکو سر آنکھوں پہ لے
مرا مشورہ الغرض ہے یہی
خدا تمکو دے کامراں زندگی
رہو تم زمانے پہ چھائے ہوئے
مگر اپنا دامن بچائے ہوئے

غرض جب ہوئی ختم یہ داستاں
سفر پر روانہ ہوا کامراں
رہی مدتوں سیرِ اقصائے ہند
کئے طے بہت دشت و دریائے ہند

زہے عظمت و شانِ ہندوستاں
یہ اک سمت اور اک طرف کُل جہاں
جلالت میں کس ملک سے کم ہے یہ
خود اپنی جگہ برِّ اعظم ہے یہ
جو خطّہ ہے زرخیز و شاداب ہے
جو ذرّہ ہے مہرِ جہاں تاب ہے
یہاں مُسکراتے گلستاں بھی ہیں
یہاں خاک اُڑاتے بیاباں بھی ہیں
سُبک رَو ہیں دریا حسیں کوہسار
سب اَسرارِ فطرت کے آئینہ دار
ہوائیں ہیں اس باغ کی مئے فروش
مناظر ہیں غارتگرِ عقل و ہوش

معیّن ھیں فصلوں کے اوقات بھی
ھے سردی بھی گرمی بھی برسات بھی

ھر اك شئے میں ھے زندگی کا فسوں
رواں نبضِ خس میں ھے لالے کا خوں

چمن ھیں سراپا لہکتے ھوئے
یہاں پھول ھیں سب مہکتے ھوئے

بہاروں میں اِن کی پھبن دیکھئے
تماشائے سرو وسمن دیکھئے

اِدھر لہلہاتے ھوئے سبزہ زار
اُدھر صحنِ گلشن میں رقصِ بہار

وہ نہروں میں آئینہ بندی کی شان
کناروں پہ سبزے کی وہ آن بان

وہ رُم جُھم برستی ھوئی بدلیاں
پپیہے کی دلکش صدا پی کہاں

وہ فریاد کوئل کی دیوانہ وار
وہ آموں کے باغ اور وہ آن کی بہار

وہ شمشاد پر قمریوں کا جماؤ
وہ موروں کا رقص اور وہ آؤ جاؤ

دمِ صبح وہ دھیمی دھیمی ہوا
وہ چڑیاں چہکتی ہوئی جابجا
سرِ شام چھایا ہوا اک سُکوں
وہ ,,وشیاما،، کے غمگیں سُروں کا فُسوں
وہ چاندی سا شفّاف آبِ رواں
پرندوں کی باغوں میں وہ شوخیاں
وہ کانٹے کہ روحِ نظر ہو فگار
وہ صحرا کہ جن پر گلستاں نثار
چکارے کہیں ہیں ہرن ہیں کہیں
کہیں فیل ہیں کرگدن ہیں کہیں
کہیں تیندوؤں اور چیتوں کے بن
لب جو کہیں شیر ہیں نعرہ زن
غرض ہے بڑی دلکُشا یہ زمیں
وہ کیا ہے جو ہندوستاں میں نہیں
عرب کے مناظر خموش اور اداس
نظر آئینگے سندہ کے آس پاس
بہارِ عروس البلادِ عجم
ولادت گہِ تور وکاؤس وجم

چمن زارِ گجرات میں دیکھئے
وہی شان ہر بات میں دیکھئے
جو صحرائے افریقہ پر ہو غرور
تو کچھ کم نہیں ارضِ بلرامپور
فضا مغربی دیکھنی ہو اگر
تو کشمیر پر ڈالئے اک نظر
کیا تھا جو گرمی میں عزمِ سفر
تو پہلے اِسی سمت اٹھی نظر
سُنی تھیں یہاں کی بڑی خوبیاں
گیا پہلے کشمیر ہی کامراں

خدا ساز عالم ہے کشمیر کا
اسے خُلد کہنا بھی ہوگا بجا
وہ رنگیں مناظر ہیں نزدیک و دور
کہ بڑھتا ہے جن سے نگاہوں کا نور
وہ کُہسار پر برف گلتی ہوئی
چٹانوں کے دامن میں ڈھلتی ہوئی

وہ ہر سمت سبزہ لہکتا ہوا
وہ پھولوں سے جنگل مہکتا ہوا
وہ دریائے جہلم کے پانی کا رقص
لچکتی ہوئی نوجوانی کا رقص
وہ ڈل کی ہر اک موج نکھری ہوئی
کناروں پہ چاندی سی بکھری ہوئی
وہ اک خوابِ رنگیں وہ باغِ نشاط
کبھی جسمیں بچھتی تھی شاہی بساط
وہ سبزہ وہ پھول اور چوڑی نہر
دل آویز ہے جسکی ایک ایک لہر
وہ اک گلشنِ بیخزاں شالامار
جو ہے اپنی حالت کا ماتم گسار
وہ سرکش حبابوں سے معمور حوض
وہ پھولوں کی خوشبو سے مخمور حوض
وہ فوارے ہر سمت چلتے ہوئے
تڑپتے ہوئے رُخ بدلتے ہوئے
اُدھر چشمۂ شاھی و ھاروَن
کہ نظارہ پرور ہے جن کی پھبن

اک افسانۂ شوق کہتے ہوے
چناروں کی جُھرمٹ میں بہتے ہوے
لچکتی وہ پھولوں بھری ڈالیاں
وہ بیلیں بناتی ہوئی جالیاں
وہ شاداب وادی میں چڑیوں کا شور
لبِ جو چکارے پہاڑوں پہ مور
پہاڑوں کے دامن میں وہ سبزہ زار
وہ نہریں بناتی ہوئی آبشار
فضا کوہ و وادی کی ہنستی ہوئی
نظر لالہ وگل میں پھنستی ہوئی
وہ نہروں میں بجروں کی رنگینیاں
ستارے ہوں جیسے فلک پر عیاں
سُنہری وہ سیبوں کے باغوں کا رنگ
وہ سیبوں میں شاہی دماغوں کا رنگ
وہ انگور کے خوشہ ہائے خوش آب
مچلتی ہے سینوں میں جنکے شراب
معطّر ہوائیں معنبر گلاب
زمیں سے ابلتا ہے گویا شباب

نرالے ہیں نشو و نما کے اصول
یہاں بطنِ گیتی سے اُگتے ہیں پھول
وہ حُسن اور جوانی کی رعنائیاں
دمِ صبح فطرت کی انگڑائیاں
جوانی قیامت اُٹھاتی ہوئی
خموشی میں بھی گُنگُناتی ہوئی
جہاں ہو گیا مہ رُخوں کا ہجوم
زمیں پر اُتر آئے گویا نجوم
وہ قامت وہ رنگ اُن کے سُرخ و سفید
تبسّم میں وہ زندگی کی نوید
خدا نے دیا ہے جو ذوقِ نظر
بتائیں یہ مغرب زدہ بے خبر
محبت نہیں شوقِ رُسوا نہیں
چمن زارِ کشمیر میں کیا نہیں
جہاں سے جہاں تک چلے جائیے
تجلّی کی نشو و نما پائیے

غرض جب ہوئی فصلِ گرما تمام
چلا سمتِ پنجاب وہ شاد کام
وہ پنجاب کی زندہ دل سر زمیں
وہ گہوارۂ اہلِ علم و یقیں
نگاہوں کو منظر وہ کستے ہوئے
وہ جلووں کے بادل برستے ہوئے
سحر کی صباحت رُخِ شام پر
نئی اک تجلّی سی ہر گام پر
نظر در نظر عالمِ کیف بار
چمن در چمن اہتمامِ بہار
وہ راوی کی چھل بل وہ حُسنِ چناب
روانی میں جھیلم کی رقصِ حباب
اٹک کے وہ بیچین دھارے کا زور
وہ گرداب کی تہہ میں طوفاں کا شور
ترقی کی دولت خدا داد ہے
جو بستی ہے وہ شاد و آباد ہے
مگر حُسنِ لاہور ہے بیکراں
یہاں اور کچھ ہیں زمیں آسماں

جدھر دیکھئیے حُسن و تابندگی
جہاں جائیے ضَوفشاں زندگی

یہیں ہے تہ خاک نورِ جہاں
نہ بھولے گا جسکو یہ ھندوستاں

جہانگیر تھا صاحبِ تخت و تاج
جہانگیر کے دل پہ تھا اُسکا راج

یہیں اھلِ دل اھلِ عرفاں ھوئے
یہیں "ھیر رانجھا" نُمایاں ھوئے

یہیں تھا وہ نانک سا اھلِ نظر
جو اسرارِ ھستی سے تھا با خبر

ھوا سیرِ پنجاب سے شادماں
تو پھر سوئے دھلی چلا کامراں

وہ دھلی جو "دھلو" کا تھا پائے تخت
جہاں نوعِ انساں کے چمکے ھیں بخت

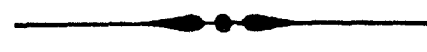
نُمایاں ھے اِس سرزمیں پر ابھی
شکوہِ جہانداری و خُسروی

کبھی یہ جگہ رشکِ بغداد تھی
علوم و معارف سے آباد تھی
ابھی تک ہیں دہلی کے نقش و نگار
اسی عہدِ مرحوم کی یادگار
یہ سونے مناظر یہ ویران کھنڈر
یہ گرتے سنبھلتے ہوئے بام و در
ابھی اِن کی نبضیں ہیں غم سے تپاں
سُناتے ہیں بھولی ہوئی داستاں
یہ قلعہ کے مِٹتے ہوئے سے نشاں
مجسم یہ دُنیا کی نیرنگیاں
کبھی تھے حقیقت حکایت ہیں اب
نظر کیلئے درسِ عبرت ہیں اب
یہیں تھا کبھی قلعۂ راج کوٹ
فلک کی پڑی جسپہ بھرپور چوٹ
یہیں حکمراں پرتھوی راج تھا
یہ ساونت بھی صاحبِ تاج تھا
پتھورا کے قلعہ کی تھی کیا نمود
نشانوں میں باقی ہے جِس کا وجود

یہیں قطب مینار ہے سربلند
جسے دیکھکر پست ہے ہر بلند
غلاموں کو شاہی ملی تھی یہیں
سیاست پناہی ملی تھی یہیں
یہیں التمش کے ملیں گے نشاں
جو ماضی کی عظمت پہ ہیں نوحہ خواں
یہیں عہد خلجی بھی ہے سوگوار
یہیں تغلقوں کی لُٹی ہے بہار
یہیں لودھیوں کے بھی آثار ہیں
زمانے کے ہاتھوں جو مسمار ہیں
یہیں سرنگوں ہے وہ مغلوں کا دور
نہ بھولے گی دنیا کبھی جن کے طور
نمایاں وہ مسجد کی شانِ جمال
جو تعمیر کے فن میں ہے بے مثال
یہی لال قلعہ کا انداز ہے
یہ تعمیر بھی قابلِ ناز ہے
کبھی جس سے تھی زینت آب و گل
دھڑکتا ہے پہلو میں اسکے وہ دل

انہیں سے ہے مغلوں کی عظمت عیاں

یہی اینٹ پتھر ہیں اک داستاں



غرض سیر دھلی سے فارغ ہوا

تو پھر رُخ کیا اکبرآباد کا

دلوں میں نہ کیوں اسکی عظمت رہے

جو اکبر کا دارالحکومت رہے

رہے عرش پر کیوں نہ اس کا مزاج

جو دنیا میں مشہور ہو "ارضِ تاج"

جہاں تاج ہے آج تک ضَوفشاں

وہ سرتاجِ اقلیمِ ہندوستاں

جو تعمیر کے فن کا اعجاز ہے

عمارات عالم میں مُمتاز ہے

کہاں حُسنِ صنعت میں اسکا جواب

یہ ہے عصرِ حاضر میں بھی لاجواب

وہ حُسن و محبت کی اک داستاں

وہ تصویرِ جذبات "شاہ جہاں"

غمِ دل عیاں جسکی روداد میں
محبت نہاں جسکی بُنیاد میں
کوئی اور ایسی نہیں سرزمیں
یہ خطّہ ہے دھلی کا پہلو نشیں
یہ مرکز ہے ذھنی مدارات کا
یہ مخزن ہے شاھی عمارات کا
وہ مسجد وہ قلعہ وہ آرام باغ
وہ چینی کا روضہ بُجھا سا چراغ
عمارت وہ کچھ کم نہیں خوش سواد
جہاں دفن ھیں میرزا اعتماد
یہ توصیف اِنکی نہیں بے محل
کہ بے مثل ھیں سیکری کے محل
ٹھٹکتی ہے اب بھی ادب سے نگاہ
کہ ہے اس میں اکبر کی آرام گاہ
کٹے گردشِ چرخ نے سو جتن
مگر پھر نہ یکجا ھوے نورتن
وہ بالغ نظر وہ سیاست پناہ
جو قومی حکومت کے تھے خیرخواہ

یہ تاریخ ہے اِسکی المختصر
ہمیشہ رہا علم وحکمت کا گھر



یہ منزل بھی آخر ہوئی ختم جب
تو آگے بڑھا کاروانِ طرب
چلا جانبِ لالہ زارِ اودھ
وہ رعنائیاں وہ بہارِ اودھ
اودھ اور وہ جانِ اودھ لکھنؤ
وہ نام و نشانِ اودھ لکھنؤ
ہوا ہے جہاں گُدگُداتی ہوئی
لطافت کے دریا بہاتی ہوئی
جسے دیکھکر جھومتی ہے نظر
جہاں مُسکراتی ہے ہر رہگذر
زمانے میں مشہور ہے اسکی شام
زبانوں پہ ''شامِ اودھ،، کا ہے نام
ہمیشہ جواں ہے جہاں زندگی
جواں آرزوئیں جواں زندگی

وہ رنگینیاں اور وہ رعنائیاں
وہ ہر گام فطرت کی انگڑائیاں
وہ لہجوں کے انداز گاتے ہوئے
خد و خال وہ مُسکراتے ہوئے
وہ خوش وضع پوشاک دلکش چلن
عیاں کجکلاہی سے وہ بانکپن
تکلّف کا آئینہ طرز بیاں
زمانہ سے مُمتاز حُسنِ زباں
کبھی تھا یہی عالموں کا وطن
یہیں سانس لیتی تھی روحِ سخن
وہ اہلِ ادب تھے یہاں انتخاب
ہوا پھر نہ دنیا میں جن کا جواب
یہیں "مجتہد" تھے وہ اربابِ علم
جو تھے رہبرِ جادۂ "بابِ علم"
اِسی سرزمیں پر تھے مسند نشیں
"فرنگی محل" کے بھی اربابِ دیں
یہیں اہلِ ایراں تھے عالی نسب
یہیں تھی بہارِ عراق و عرب

چھڑے تھے یہیں عقل و عرفاں کے ساز
کہیں اہل ظاہر کہیں اہلِ راز
غرض تھی عجب زندگی چار سو
گلستانِ فردوس تھا لکھنؤ
رئیسوں سے تا شاہِ والا نشاں
سبھی علم پرور سبھی قدر داں
یکایک ہوا کا جو رُخ پھر گیا
وہ ایوانِ عیش و طرب گِر گیا
نہ وہ زندگی اور جوانی رہی
نہ وہ گومتی کی روانی رہی
وہ موجیں کہ تھیں نغمہ آرا کبھی
رہی اِن میں شوخی نہ وہ زندگی
کہاں "قیصری باغ" کا وہ سماں
نسیم آکے بھرتی ہے اب سِسکیاں
"چھتر منزل" اب غم کی ہے پردہ دار
کبھی آنکلتے ہیں کچھ سوگوار
نہ وہ چوک کی خوش نمائی رہی
وہ دل اور نہ وہ دلربائی رہی

سحر ہے نہ وہ منظرِ شام ہے
مگر اب بھی " شامِ اودھ " نام ہے
جہاں جائیے عیشِ برھم کی یاد
جدھر دیکھئے " جانعالم " کی یاد
نگاھوں کا حاصل پریشانیاں
رُخ افسردہ آنکھوں میں ویرانیاں
الٰہی یہ دم بھر میں کیا ھوگیا
زمانہ ھی کچھ دوسرا ھوگیا
سدھارے پُرانے ھوا خواہ بھی
ھوئے قید " واجد علی شاہ " بھی
مقدر کی بیداد کا کیا جواب
کہاں " مَٹیا بُرج " اور کہاں آفتاب
ھوا ہے وھاں " ھوش " میرا گذر
جہاں اب ھیں دیوار و در نوحہ گر
وہ سونی سی تُربت فَضا سوگوار
یہیں سو رھا ہے وہ عالی وقار
خدا اِن کو دے امتیاز قبول
چڑھائے ھیں مَیں نے جو اشکوں کے پھول

وہ منظر وہاں کا ہے عبرت فزا
بہت دیر تک میں یہ سوچا کیا
کہ دنیا کا بھی کچھ عجب حال ہے
عجب شانِ ادبار و اقبال ہے
تہِ خاک ہے آج اُسی کا قیام
ثریّا سے اونچا تھا جس کا مقام
نگاہوں میں حسرت سی چھانے لگی
یہ کانوں میں آواز آنے لگی
کہاں زندگی کو ثبات وقیام
تغیر کو حاصل ہے عمرِ دوام
جو زندہ ہے اِس رَو میں بہ جائیگا
رہا ہے کوئی اور نہ رہ جائیگا
زمانہ یونہی گرمِ بیداد ہے
کوئی داد اس کی نہ فریاد ہے
جنھوں نے سیاست کا سمجھا ہے رنگ
یہ کہتے ھیں دانشورانِ فرنگ
کہ یہ مشورہ نیک وصائب نہ تھا
یہ الحاق اودہ کا مناسب نہ تھا

کب آیا ہے اُن کو ہمارا خیال
زہے دلنوازی زہے انفعال

یہاں سے کچھ آگے ہے ملک بہار
روایاتِ ماضی کا آئینہ دار
اودہ سے چلا اُس طرف کامراں
سَلف کا جو دُھندلا سا ہے اک نشاں
وہ آثارِ حکمت وہ علمی شعار
خوشا منظرِ سر زمینِ بہار
یہیں تھا کبھی مکتبِ راجگیر
نہ تھی ساری دنیا میں جس کی نظیر
یہیں ,,بُدہ،، سے بھگوان پیدا ہوئے
,,اشوکا،، سے انسان پیدا ہوئے
یہیں چانکیہ جیسے فاضل ہوئے
جو علمِ سیاست میں کامل ہوئے
یہیں جلوہ گر تھیں بصد عِزّ و شان
وہ مگدھا وہ متھلا کی سلطانیاں

خوابگاہ تہذیب کہن

جنک کی بھی تھی راجدھانی یہیں
فروکش تھی "سیتا" سی رانی یہیں
یہیں چندر گُپتا سا تھا سُورما
سکندر ھوا جس کا مدحت سرا
یہیں مسند آرا ھوا شیر شاہ
یہیں سیّدوں کو ملی تھی پناہ

یہیں سے ھے بنگال کی حد قریب
جہاں علم و دانش کے چمکے نصیب
یہ مشہور جادو کی ھے سرزمیں
نگاھوں کا جادو بھی کچھ کم نہیں
وھی حُسن ھے آج بھی جلوہ گر
وہ تیکھی اَدائیں وہ تِرچھی نظر
وھی حوصلوں کی بلندی بھی ھے
وھی دانش و ھوشمندی بھی ھے
وہ زلفِ رسا رنگ وہ سانولے
ملاحت کے آب ونمک سے پلے

وہ رُخ پر تبسّم کا ھلکا سا نور
وہ آنکھیں جوانی کی صہبا سے چور
وہ کالی کے مندر کا رنگیں سماں
دل و جاں کی پیہم وہ قربانیاں
نگاھوں سے اوجھل ھوا یہ چمن
تو اب وہ چلا سوئے ارضِ دکن
کہ سُنتا تھا بچپن ھی سے کامراں
یہاں ھُن برسنے کی اک داستاں
رَوِش ھے ابھی حیدرآباد کی
اسی عہدِ فرخندہ بُنیاد کی
نمایاں ھے اِس کی فضا میں ابھی
وھی مَشرقی طرز کی زندگی
وھی اُن کا مخصوص طرزِ کلام
وھی والہانہ ادائے سلام
تکلّف میں ڈوبی ھوئی بات بات
نگاھیں اک آئینۂ التفات
یہاں بہمنی سلطنت کے نشاں
ابھی تک ھیں سرنامۂ داستاں

وہ گُلبرگہ کا قلعہ اور وہ حصار
آسی عہدِ سطوت کی ہے یادگار
عجب آدمی تھے عجب طور تھے
عجب محفلیں تھیں عجب دور تھے
محبت میں تھے دل سموئے ہوئے
خلوص و ارادت میں کھوئے ہوئے
تعصّب سے روحیں مکدّر نہ تھیں
نگاھیں عداوت کی خوگر نہ تھیں
یہیں تھا وہ درویشِ ایماں نواز
لقب جسکا ھے شاہِ گیسو دراز
دیا جس نے یہ درسِ علم و یقیں
،، خدا کی حکومت خدا کی زمیں ،،
رھے بہمنی ڈیڑھ سو سال تک
مگر تاك میں تھی نگاہِ فلك
لُٹا عہدِ محمود میں کارواں
ابھی ھیں وہ مٹتے ہوئے سے نشاں
سیاست نے کروٹ جو بدلی نئی
ہوئیں دولتیں اور قائم کئی

وہ عادل شہی عہدِ عالم فروز
کہ شب جسکی تھی غیرتِ نیمروز
بریدی سلاطیں بھی کچھ کم نہ تھے
وہ ارضِ دکن پر تھے چھائے ہوے
ہمیشہ رہے گا زمانے کو یاد
بیدر کا وہ فردوس منظر سواد
زعیمانِ فوجی کی عقلیں تھیں دنگ
وہ تھے چاند بی بی کے آئینِ جنگ
کوئی سلطنت تھی نہ جسکی مثیل
وہ تھا قطب شاہی کا عہدِ جمیل
یہ سلطان تھے گو صاحبِ زور و زر
مگر ،، روحِ مذہب،، سے تھے باخبر
گدائے درِ اہلبیتِ نبیؐ
شناسائے عزمِ حسینؑ و علیؑ
دلوں میں بزرگوں کا تھا احترام
بہت زندگی کا تھا سادہ نظام
یہ اسرارِ عرفاں سے آگاہ تھے
غلط بیں نہ تھے واقفِ راہ تھے

تلاش اهل دل کی طبیعت میں تھی
اك آسودگی آنکی سیرت میں تھی
حیات آفریں تھا وہ آن کا چلن
کہ تھی خاروخس میں بھی روحِ سمن
بہت برکتیں تھیں بہت راحتیں
نمایاں ھیں آس عہد کی صنعتیں
وہ مشہور حوض اور وہ آسکی بنا
کٹورہ سا جو گولکُنڈے میں تھا
نفاست میں تھا آپ اپنا جواب
همیشه چھلکتا تھا جس میں گلاب
آسی دور کا یہ بھی ھے امتیاز
ابھی مکہ مسجد ھے سجدہ نواز
سنوارے گئے قصرو بازار بھی
بنایا گیا چارمینار بھی
یہیں گولکنڈے کے دیوار و در
یہ ٹوٹی فصیلیں یہ سُونے کھنڈر
آسی دور کے ھیں شکستہ نشاں
آسی عہدِ رفتہ کے ھیں نوحہ خواں

نوازن ہے ٹوٹا ہوا سازا بھی
کہ آتی ہے ’’لاری‘‘ کی آواز ابھی
زبانوں پہ جن کے ابھی نام ہیں
وہ سلطاں یہیں محوِ آرام ہیں
انہیں سے ملیں نُطق کو گرمیاں
پلی ان کے دامن میں اردو زباں
نمایاں ہیں غزلوں کے نقش ونگار
ابھی آنکے نوحوں سے دل ہیں فگار
یہ توسیع دولت یہ شانِ بلند
مزاجِ فلک کو ہوئی ناپسند
تغیّر کی بجلی گرا کر رہا
اِسے بھی یہ ظالم مٹا کر رہا
ہوئی اِنکی تقدیر جب روبراہ
تو پھر مسند آرا ہوئے تانا شاہ
مگر پھر چکی تھی ہوائے نشاط
فلک نے یہ آخر آلٹ دی بِساط
مغل بے سبب ہوگئے بدگُماں
بڑھا اِسطرف اِن کا سیلِ رواں

مگر مُدتوں چوٹ کھاتے رہے
مسلسل شکستیں اُٹھاتے رہے
اُلٹ ہی گئے ہوتے مغلوں کے تیر
اگر ٹوٹ جاتے نہ غدّار امیر
غرض گولکُنڈے نے کھائی شکست
نشاں ہو گیا بخت و دولت کا پست
ابھی تک سماں دولت آباد کا
مرقع ہے اک قلبِ ناشاد کا
ابھی سر نگوں ہے وہ قصر تباہ
مقید رہے تھے جہاں تانا شاہ
اُداسی ہے دیوار و در سے عیاں
کہ ہر ذرّہ عبرت کا ہے اک جہاں
یہ آثار ہیں درد و غم کے گواہ
ہواؤں میں اب بھی ہے دھیمی سی آہ
ابھی تک ہے اِس غمکدے سے عیاں
اسیرِ ستم اک رہا تھا یہاں
تعجب ہے اِس پر کہ اورنگ زیب
سیاست میں کھا جائے ایسا فریب

یہ دولت ھی کیا خاک میں مل گئی
مغل سلطنت کی بِنا ھلِ گئی
سیاست کی لَغزِش تھی یہ با لیقیں
زمانہ جسے بھول سکتا نہیں
دکن کی تباھی کا اور اک سبب
ھوئی مضمحل جس سے روحِ طرب
تمنائے توسیع دولت ھوا
خیالِ فروغِ حکومت ھوا
نئے پینچ دن رات پڑتے رھے
سلاطیں یہ آپس میں لڑتے رھے
بریدی ھوئے نذرِ عادل شہی
زمانے کے ھاتھوں یہ ذِلّت سہی
عمادوں سے فِرّشہی چھین کر
بڑھے عادل اور شاہِ احمد نگر
ھوا جبکہ مغلوں کا عہدِ نشاط
اُلٹ دی مقدر نے اُن کی بساط
یہ داغِ ندامت اِنہیں بھی ملا
یہ فرمانِ قدرت اِنہیں بھی ملا

ڈھلا بخت و دولت کا جب آفتاب
مغل بھی ہوئے کُشتۂ انقلاب
غرض یہ زمانے کا آئین ہے
اِسی میں نہاں رازِ تکوین ہے
یہ جوئے زمیں کی جنوں خیزیاں
سکھاتی ہیں آپس میں خونریزیاں
دکن کی ہے القصہ وہ سر زمیں
بہت شاہیاں جس میں بگڑی بنیں
یہاں کا ہر اک ذرّۂ ناتواں
گزشتہ جلالت کی ہے داستاں
رہا بن کے آخر حریفِ شَکیب
وہ غم جسکے بانی تھے اورنگ زیب
مرہٹوں نے چھیڑا حکومت کا راگ
ہر اک سَمت بھڑکی بغاوت کی آگ
ہر اک قوم تھی بر سرِ اختلاف
وہ اپنے ہوں یا غیر سب تھے خلاف
حکومت کا بگڑا ہوا طور تھا
دکن کا یہ وہ مضطرب دور تھا

یہاں جو مقرّر ہوا صو بیدار
رہی زندگی آسکی نا خوشگوار
نئی آفتیں روز آتی رہیں
نئی شورشیں سر آٹھاتی رہیں
مرہٹوں کے آگے نہ کچھ چل سکی
حکومت کو دینی پڑی ,, چوتھ ،، بھی
نگاہیں قیادت کی شرما گئیں
وہ بد نظمیاں ملک پر چھا گئیں
سزا بے نیازی کی ملنے لگی
بنا قصرِ دہلی کی ہِلنے لگی
مگر ایک آصف کی طبع رَسا
جو رازِ سیاست سے تھی آشنا
حکومت کے انجام کو پا گئی
وہ سمجھے کہ منزل قریب آگئی
رہے تھے وہ اِس ملک میں صو بیدار
یہاں کی روش آن پہ تھی آشکار
بڑے دور بیں واقف راہ تھے
سیاَسی منازل سے آگاہ تھے

دکن کی طرف پھیردی پھر عناں
کہ دھلی میں تھی سلطنت نیم جاں
زکیں ھر مخالف کو دیتے گئے
خراج اپنی ھمّت کا لیتے گئے
غرض یہ حقیقت ہے سب پر عیاں
بنا اس حکومت کی رکھی یہاں
جو دربارِ دھلی کی ھے یادگار
خدا اسکو رکھے سدا کامگار

یہیں متّصل ھیں ایلورہ کے غار
یہ دنیامیں ”بُدھ مت“ کی ھیں یادگار
پہاڑوں میں ترشے ھوئے ھیں مکاں
چٹانوں پہ کندہ ھے اک داستاں
کتھا ھے کہیں بُدھ کے نروان کی
شبیہیں کہیں گیان اور دھیان کی
اجنٹہ جو ھے دیوگڑہ سے قریب
وھاں بھی ھے ایسی ھی صنعت عجیب

بہت کروٹیں لے چکا روزگار
مگر ان کے باقی ھیں نقش و نگار
در و سقف و دیوار سے ھے عیاں
یہ حُسنِ عقیدت کی ھیں خوبیاں

کئی روز خوش خوش ٹھہر کر یہاں
چلا سمت میسور اب کامراں
فروغِ نظر ھے جہاں کا غُبار
وہ ھے "پور حیدر علی" کا مزار
ھر اک سانس تھی جسکی درسِ حیات
ابھی رو رھی ھے جسے کائنات
بشر ایسے ھوتے ھیں پیدا کہاں
یہ جلوے دکھاتی ھے دنیا کہاں
پرستارِ ایمان و عرفاں تھا وہ
کہ شیدائے شاہِ شہیداں تھا وہ
دل اسکا تھا معمورِ علم و یقیں
جُھکائی نہ باطل کے آگے جبیں

شبِ تار جسکی سحر بن گئی
گئی سلطنت جان پر بن گئی
ذرا اسکی چتون پر آیا نہ بل
بڑھا اور بھی جوشِ سعی و عمل
ڈراتے رہے صبح وشامِ زوال
نہ بدلا مگر اس کا عزم وخیال
حریفوں سے مردانہ لڑتا رہا
وہ جرّار شیرانہ لڑتا رہا
وہ اسکا تہوّر وہ آئینِ جنگ
الٹنے کو تھی خود بساطِ فرنگ
جوان کی طرف ہو نہ جاتے نظام
تو ہوتی نہ یوں اسکی شاہی تمام
بظاھر شکست اسکو حاصل ہوئی
مگر حق یہ ھے فتح کامل ہوئی
منظم ھیں جب تک زمین آسمان
اِسے یاد رکھے گا ھندوستان

اِدھر سے ہے مدراس بھی متصل
جہاں اور ہے صورتِ آب وگلِ
یہاں ہیں جو اقوامِ آشفتہ حال
یہ سب تھیں کبھی ساکنانِ شُمال
اِدھر بہر تسخیرِ ھندوستاں
بڑھا آریوں کا جو سیلِ رواں
جو قومیں وھاں خُرّم و شاد تھیں
ھماله کی وادی میں آباد تھیں
ھوا اُن کی قسمت کا سورج غروب
روانہ ھوئیں سب وہ سوئے جنوب
جو وندھیا کو طے کرکے آئیں یہاں
انہیں کی ھیں اب اِس میں آبادیاں
ابھی اِن میں باقی ھیں ماضی کے ڈھنگ
وھی شکل وصورت وھی آب ورنگ
مسلماں بھی پہلے یہاں آئے تھے
فضا ارضِ توحید کی لائے تھے
یہاں جو مسلمان آباد ھیں
عرب اُن کے آبا واجداد ھیں

یہاں سے چلا بمبئی کامراں
زمیں جسکی ہے غیرتِ آسماں
جو صورت گرِ سحر واعجاز ہے
جو اک پیکرِ ناز وانداز ہے
جو دنیا ہے رندانِ سرشار کی
جو بستی ہے حُسنِ اداکار کی
لئے ہے جسے گود میں کوھسار
سمندر ہے جس کا اک آئینہ دار
وہ غازہ شفق کا سُہانی وہ شام
زمیں پرستاروں کا وہ اژدھام
کمر کا وہ لوچ اور وہ بازو کُھلے
وہ دھیمی ہوائیں وہ گیسو کُھلے
وہ آٹھتی جوانی وہ مستانہ چال
کہ رفتارِ موجِ رواں پائمال
وہ قامت قیامت سے ملتا ہوا
لب ورخ کہ اک پھول کِھلتا ہوا
جبیں وہ کہ روشن سوادِ جہاں
نگاہیں چمکتی ہوئی بجلیاں

لباسوں کی وہ دل نشیں آب و تاب
کہیں چاندنی اور کہیں آفتاب
بُت پارسی کوئی سرو وسمن
دلوں پر نگاہوں سے ناوک فگن
بہ رُخ لالہ رنگ و بہ قد نونہال
سراپا تبسّم سراپا جمال
یہ پانی میں ہے عکسِ حُسن وشباب
کہ اک ماھئی سُرخ ہے زیرِ آب
خبر لے رھی ہے یم و دشت کی
لگائی ہوئی آگ زردشت کی
نگاہوں میں کیفِ نہاں کا سُرور
اداؤں میں حُسنِ عیاں کا غُرور
وہ لہجوں میں نغمے کی رعنائیاں
لطافت کے چشموں کی انگڑائیاں
ادا ہر قدم گُنگُناتی ہوئی
وہ فتنوں کی رُت لہلہاتی ہوئی
خدوخال موتی سے نکھرے ہوئے
وہ ہر سَمت انوار بکھرے ہوئے

یہاں سے چلا بمبئی کامراں
زمیں جسکی ہے غیرتِ آسماں
جو صورت گرِ سحر و اعجاز ہے
جو اک پیکرِ ناز و انداز ہے
جو دنیا ہے رندانِ سرشار کی
جو بستی ہے حُسنِ ادا کار کی
لئے ہے جسے گود میں کوہسار
سمندر ہے جس کا اک آئینہ دار
وہ غازہ شفق کا سُہانی وہ شام
زمیں پرستاروں کا وہ اژدہام
کمر کا وہ لوچ اور وہ بازو کُھلے
وہ دھیمی ہوائیں وہ گیسو کُھلے
وہ اٹھتی جوانی وہ مستانہ چال
کہ رفتارِ موجِ رواں پائمال
وہ قامت قیامت سے ملتا ہوا
لب و رخ کہ اک پھول کِھلتا ہوا
جبیں وہ کہ روشن سوادِ جہاں
نگاہیں چمکتی ہوئی بجلیاں

لباسوں کی وہ دل نشیں آب و تاب
کہیں چاندنی اور کہیں آفتاب
بُت پارسی کوئی سرو وسمن
دلوں پر نگاہوں سے ناوک فگن
بہ رُخ لالہ رنگ و بہ قد نونہال
سراپا تبسّم سراپا جمال
یہ پانی میں ہے عکسِ حُسن و شباب
کہ اک ماھئی سُرخ ہے زیرِ آب
خبر لے رہی ہے یم و دشت کی
لگائی ہوئی آگ زرتشت کی
نگاہوں میں کیفِ نہاں کا سُرور
اداوں میں حُسنِ عیاں کا غُرور
وہ لہجوں میں نغمے کی رعنائیاں
لطافت کے چشموں کی انگڑائیاں
ادا ہر قدم گُنگُناتی ہوئی
وہ فتنوں کی رُت لہلہاتی ہوئی
خدوخال موتی سے نکھرے ہوئے
وہ ہر سمت انوار بکھرے ہوئے

وہ سَرکشَ جوانی لہَکتی ہوئی
مچلتی لچکتی بہکتی ہوئی
نِگاہوں کی ہر سَمت وہ دیکھ بھال
وہ سچّا نشانہ کہ بچنا محال
پیامِ محبت پیامِ اجل
وہ تیکھی ادائیں وہ تیوری پہ بل
وہ رفتار نازک سی موجِ خیال
مہکتی ہوائیں لہکتے جمال
وہ مستی بھرے دیدۂ نیم باز
وہ باھوں کا لوچ اور وہ شیریں گداز
جبیں زندگی سے دمکتی ہوئی
لبوں کی وہ سُرخی دھکتی ہوئی
کسی کو کوئی دیکھ کر شاد شاد
کوئی بامراد اور کوئی نامراد
کوئی نو بہ نو چوٹ کھائے ہوئے
کوئی دل کے چرکے چھپائے ہوئے
وہ آئینہ تمثال ہر رہگذر
شگفتہ جسے دیکھ کر ہو نظر

دُکانیں حسینوں کا جیسے بناؤ
وہ دلّال اور گاھکوں کا جماؤ
وہ دنیا کے دیوانۂ و ھو شیار
تجارت کی دیوی کے خدمت گزار
وھی کچھ سمجھتے ھیں جینے کا راز
انھیں کیوں نہ ھو اپنی ھستی پہ ناز
نظر آئے وہ ساز و ساماں یہاں
کہ غرق تحیر ھوا کامراں

سیاحت ھوئی ھند کی جب تمام
ھوا کامراں عازمِ روم و شام
اُٹھے بادباں اور لنگر کُھلا
نظر کے لئے تازہ منظر کُھلا
غرض کچھ دنوں تک یہ ھمّت شعار
رھا جادہ پیمائے شہر و دیار
ملا غیر ملکوں کے تجار سے
تجارت کے ارکان و احرار سے

ہوا آشنائے نشیب و فراز
کُھلے زندگی کے بہت اِس پہ راز
عرب کے کبھی ریگزاروں میں تھا
کبھی وہ عجم کی بہاروں میں تھا
رواں تھا کبھی نجد کے دشت میں
کبھی تھا مصلےٰ کی گُلگشت میں
کبھی ارضِ بغداد میں تھا مکیں
کبھی مصر و کنعاں کی تھی سرزمیں
سمرقند دیکھا کبھی کاشغر
کبھی بابل و نینوا کے کھنڈر
کبھی شادماں تھا کبھی درد مند
طبیعت تھی بیگانۂ قید و بند
وہ تکمیل مشرق کی جب کرچکا
بصد شوق پھر قصد یورپ کیا
جو مغرب میں داخل ہوا کامراں
زمیں ہوگئی روکشِ آسماں
ہر اک چیز مغرب کی تھی دلکشا
فَضا حُسن پرور ہوا جانفزا

معیشت کے اسباب تھے بے شمار
بڑی صنعتیں تھیں بڑا کارو بار
بہت اہل جو ہر بہت ہوشمند
جسے دیکھئے اُس کی ہمّت بلند
شکایت مقدّر کی تھی ناروا
اشاروں پہ تھا اُن کے رقصِ ہوا
کوئی عزم و ہمت سے خالی نہ تھا
کسی کو غمِ خستہ حالی نہ تھا
بہت مختلف تھے وہاں صبح شام
نیا میکدہ تھا نیا دورِ جام
وہاں اُس نے دیکھے جوشہر ودیار
نظر آ گئی قدرتِ کردگار
وہ شہروں کی رونق وہ اُن کا نظام
کوئی بات جس میں نہ تھی نا تمام
وہ بازار وہ راستے وہ مکاں
نرالی فضائیں نئے گلستاں
وہ ذوقِ عمل اور وہ بیداریاں
تجارت کی وہ گرم بازاریاں

وہ حیرت فزا صنعتوں کا ہجوم
وہ ہر بزم میں علم و دانش کی دھوم
سلیقے تجارت کی ہر جنس میں
بہاریں گلستان سائنس میں
سحر نے اُدھر لیں جو انگڑائیاں
ہوئی کارخانوں میں بجلی رواں
سرِ شام وہ دعوتِ چشم و گوش
وہ ہر سمت ہنگامۂ نا و نوش
یہاں ہوشمندی کے سب کام تھے
نہ اوہام تھے اور نہ اصنام تھے
وہ طوفاں کی شورش کے قائل نہ تھے
پہاڑ اُن کی راہوں میں حائل نہ تھے
جسے دیکھئے محوِ سعی و عمل
نگاہیں عمیق اور ارادے اٹل
جواں ہمتیں صاف سُلجھے خیال
جبینوں پہ بیداریوں کا جلال
تصوّر اچھوتے نرالے قیاس
جہاں در جہاں علم و دانش کی پیاس

یہاں اِس پہ ہستی کے منظر کُھلے
یہاں عزم و ہمّت کے جوہر کُھلے
یہاں اِسنے سمجھا کہ انساں ہے کیا
یہ اک مشتِ خاکِ پریشاں ہے کیا
وہ اس راز سے اب ہوا با خبر
کہ انساں میں ہیں قدرتیں کسِ قدر
ہوا اِس سے لیتی ہے درسِ خرام
ستاروں سے اونچا ہے اُس کا مقام
فَضا میں یہ چاہے تو جا کر رہے
نئی ایک دنیا بنا کر رہے
یہ چاہے تو ہو بیحدو و بیکراں
یہ ذرّات کا مختصر سا جہاں
یہ چاہے تو خم ہو فلک کی جبیں
ستارے اُگلنے لگے یہ زمیں
یہ چاہے تو موجوں کا رُخ پھیردے
عناصر کی فوجوں کا رُخ پھیردے
یہ چاہے تو صحرا بنے گلستاں
یہی خاک بن جائے جنس گراں

نئے تجربے اُس نے حاصل کئے
جو اجزا ادھورے تھے کامل کئے
کبھی اُس نے نیپلز کی سیر کی
کبھی روس دیکھا کبھی جرمنی
کبھی جا کے سسلی کا ماتم کیا
کبھی اُس نے اسپین کا غم کیا
فضا تھی کبھی ارضِ بلقان کی
کبھی دانش و علم یونان کی
کبھی ٹیمز میں اُس کی کشتی رواں
کبھی سیر پیرس سے تھا شادماں
طریقے اُسے آگہی کے ملے
سلیقے اُسے زندگی کے ملے
اِسی میں یہ آتا تھا اُس کو خیال
تصوّر کی نبضیں تھیں جس سے نڈھال
کہ یہ خم بہ خم زُلفِ برہم ہے کیا
یہ تہذیب کیسی یہ عالم ہے کیا
مگر پھر سُراغِ یقیں مل گیا
جو وہ چاہتا تھا یہیں مل گیا

ہوا رفتہ رفتہ یہ پیدا خیال
نہیں ایک انساں کی سیرت کا حال
تمدّن جدا مختلف ہیں چلن
شگوفے بہت ایک ہے گو چمن
یہ ہے وضع اخلاق بدلی ہوئی
یہاں ہے یہی شیوۂ زندگی
نظرِ ان مناظر پہ کیوں کیجئے
جو خوبی کہیں ہو وہ لے لیجئے



سُن اے ساقیٔ وقت ہنگامہ ساز
حقیقت پسند و محبت نواز
یہ مغرب میں ابر گراں بار ہے
کہ فطرت کی اک موجِ سرشار ہے
کچھ ایسی فضا ہے کچھ ایسی ہوا
کہ جامِ اجل بھی ہے پینا روا
چلے دم بدم آج ساغر کا دور
نئے ہوں غم زندگانی کے طور

رهوں کیا زمانے کے گرداب میں
مجھے تو ڈبو دے مئے ناب میں
چڑھے اِسطرح گھر کے نشہ کا ابر
رہے کچھ نہ هستی کے طوفاں کا جبر
وہ لهریں آٹهیں دل میں بے اختیار
کہ هو کیف مئے بڑھ کے رنگِ خمار
مری کشتئی شوق هو یوں رواں
ترا لُطف جس کا بنے بادباں
میں طوفانِ غم میں ابھرتا رهوں
انہیں ظلمتوں میں سنورتا رهوں
کہاں میں تری کشتئی مئے کہاں
هر اك سانس هے میری تختِ رواں
کسے نشۂ زور و زر چاهئے
فقط ایك تیری نظر چاهئے
غرض سیر کرتا هوا کامراں
پھرا مطمئن سوئے هندوستاں
وہ دل میں امیدیں لئے صف بہ صف
چلا آرها تھا وطن کی طرف

تصور تھا ساحل کا پیشِ نظر
بآرام طے ہو رہا تھا سفر
کھٹکتی تھی سینے میں یاد وطن
قریب آ رہا تھا سوادِ وطن
بہت شاد تھا دل میں وہ خوش نہاد
کہ تھی ہم سفر اس کی بادِ مراد
کوئی فکر و اندیشہ و غم نہ تھا
سفر میں سکوں گھر سے کچھ کم نہ تھا
مگر ایک دن یک بیک وقتِ شام
ہوا مُنقلب عشرتوں کا نظام
بلا آ گئی آن کی آن میں
سفینہ گھرا اس کا طوفان میں
اٹھی سَمتِ مغرب سے کالی گھٹا
بدلنے لگی اپنے تیور ہوا
یہ گھبرا کے دی ناخدا نے خبر
تباہی کے آثار ہیں سربسر
نہیں کوئی غیر از خدا کارساز
کہ خطرہ میں آیا ہوا ہے جہاز

ابھی تھا یہ اس کی زباں پر کلام
کہ بادِ مخالف ہوئی تیز گام
جھکولے وہ بیطور کھانے لگا
لرزنے لگا ڈگمگانے لگا
تلاطم وہ موجوں کا آندھی کا زور
گرجتے ہوئے بادلوں کا وہ شور
اندھیرا وہ ہر سمت گھرتا ہوا
سماں غم کا آنکھوں میں پھرتا ہوا
کوئی زندگی کا سہارا نہ تھا
فلک پر عیاں کوئی تارا نہ تھا
بچھایا تھا ظُلمت نے دامِ اجل
ہوا دے رہی تھی پیامِ اجل
قیامت کی افتاد ہر دل پہ تھی
یہاں جسم تھا روح ساحل پہ تھی
کہ تھا مُبتلائے نشیب و فراز
خزاں دیدہ پتہ کی صورت جہاز
وہ گرداب کا گھیر لینا کبھی
سفینہ کا منہ پھیر لینا کبھی

وہ طوفاں تباھی کا تھا ولولہ
سمندر میں آیا تھا اك زلزلہ
بھیانك تھی وہ زندگی کی گھڑی
مجسم قضا سامنے تھی کھڑی
مسافر تھے سب خوف سے بد حواس
کسی کو نہ تھی اپنے بچنے کی آس
عیاں کون سے رخ سے وحشت نہ تھی
کسے زندگی کی ضرورت نہ تھی
جوانوں کے چہرے تھے بے آب و تاب
اجل آرھی تھی نظر بے نقاب
دلوں پر وہ رُعبِ اجل چھا گیا
خدا منکروں کو بھی یاد آگیا
نمایاں بحالِ زبوں تھا کوئی
کبھی خوف سے سرنگوں تھا کوئی
یکایك ھوئی توپ خطرہ کی سر
بہت سب نے دیکھا اِدھر اور اُدھر
مگر کوئی پہنچا نہ بہرِ مدد
بڑھی اور بے باك موجوں کی زد

سفینہ تھپیڑوں سے چکرا گیا
بڑھا اور چٹانوں سے ٹکرا گیا

مرادوں بھرے دل ہوئے غرقِ آب
ملی شامِ غفلت یہ تعبیرِ خواب

عرض تھا نہ جوہر نہ تھا کیف و کم
ہوئی ختم شرحِ وجود و عدم

نہ دریا نہ موجیں نہ ابرِ بہار
نہ ساقی نہ ساغر نہ کیف و خمار

نہ اعجاز جلوہ نہ سحرِ جمال
نہ عشق و محبت نہ ہجر و وصال

نہ اب جہل و حکمت نہ زہد و گناہ
نہ اب سطح بینی نہ گہری نگاہ

نہ وہ پاکبازی نہ مئے نوشیاں
نہ ہُشیاریاں اور نہ بے ہوشیاں

یہ اجزاء بہا کر فنا لے گئی
اک آسائشِ مستقل دے گئی

ہوئیں عشرتیں ختم غم بہہ گیا
فقط نام اللہ کا رہ گیا

وہ تختوں کا اک مُنتشر کارواں
سمندر کے آغوش میں تھا رواں
اُنہیں میں سے تھا ایک پرکاہ ساں
ستم پرورِ انقلابِ جہاں
تلاطم کے صدمے اُٹھاتا ہوا
تھپیڑے سمندر کے کھاتا ہوا
سراپا وہ کف میں نہایا ہوا
وہ لہروں کے چکر میں آیا ہوا
زمانے کی رنگیں فضاؤں سے دور
نہ ظُلمت کا ہوش اور نہ ادراکِ نور
کہیں روح سہمی ہوئی دل میں تھی
روانی کہاں نبضِ بسمل میں تھی
غضبناک موجیں تھیں چاروں طرف
مصائب کی فوجیں تھیں چاروں طرف
نہ ظاہر میں بچنے کے تھے طور کچھ
مقدّر کو منظور تھا اور کچھ
طمانچوں کو طوفاں کے سہتا ہوا
چلا جارہا تھا وہ بہتا ہوا

بہت گرچہ موجوں میں تھا اضطراب
وہ تختہ تھا دستِ خضر کا جواب
سفینہ کی صورت بہا رات بھر
لگا آکے ساحل پہ وقتِ سحر
وہ ناکام اور نام کا کامراں
کنارے جو پہنچا سحر تھی عیاں
اُفق پر تھی صبح ازل کی سی ضو
سحر تھی کہ آغازِ دُنیائے نو
خموشی میں بھی گُنگُناتی ہوئی
نگاہوں سے پردے اُٹھاتی ہوئی
وہ اک حُسنِ رقصاں تجلّی بدوش
وہ سرشاریاں اور پیغامِ ہوش
اِدھر موج در موج بیداریاں
کنارے پہ غش آسطرف کامراں
وہ سِمٹے ہوئے دست و پا سرد سرد
وہ ڈوبا ہوا دل وہ رُخ زرد زرد
نسیمِ سحر گُد گُداتی رہی
لگا تار شانہ ہِلاتی رہی

شعاعوں نے لے لیکے انگڑائیاں
دکھائیں بہت کچھ مسیحائیاں
زمیں نور سے جگمگانے لگی
یہ فطرت کی آواز آنے لگی
تری بیکسی کی خبر ہوگئی
اُٹھ اے سونے والے سحر ہوگئی
مگر پھر بھی آیا نہ وہ ہوش میں
نہ جُنبش ہوئی نبضِ خاموش میں
غرض آگیا جب سحر کا شباب
بڑھی روئے خورشید کی آب وتاب
ہوا گرمیاں کچھ دکھانے لگی
ذرا جسم میں جان آنے لگی
مصیبت کا مارا ہوا کامراں
ستم کش بلا آشنا نیم جاں
حرارت سے بیدار ہونے لگا
کھلی آنکھ ہُشیار ہونے لگا
شبِ تار کو روشنی مل گئی
وہ کھوئی ہوئی زندگی مل گئی

اِدھر اور اُدھر جب اُٹھائی نظر
تو دنیا ھی اور اسکو آئی نظر
سرے سے یہاں کا سماں اور تھا
زمیں اور تھی آسماں اور تھا
وہ کشتی نہ وہ ساز وساماں کہیں
نہ حدّ نظر تک تھے انساں کہیں
وہ حیران تھا ماجرا کیا ھے یہ
میں ھوں کس جگہ اور ھوا کیا ھے یہ
کہاں ھیں وہ خادم وہ سامان سب
وہ کشتی وہ کشتی کے انسان سب
بہت غور کرنے پہ آیا خیال
کہ طوفان کا ھے یہ شائد مآل
سفینہ وہ نذرِ اجل ھوگیا
سمندر کی آغوش میں سوگیا
ھوئے جب ذرا ھوش اُس کے بجا
کیا لیٹے لیٹے ھی شکر خدا
ابھی ھِلنے جُلنے کی طاقت نہ تھی
ابھی اُس میں اُٹھنے کی ھمّت نہ تھی

پڑا دھوپ ھی میں وہ جلتا رھا
وھیں کروٹیں سی بدلتا رھا
یہاں تک کہ آخر ڈھلا آفتاب
سوئے ارضِ مغرب چلا آفتاب
بِکھرنے لگی زلفِ لیلائے شام
کھنکنے لگے کیفِ پنہاں کے جام
چلی جھوم کر روح پرور ھوا
ملی کامراں کو نویدِ شفا
زمیں سے بہ مشکل اُٹھا غم نصیب
بہت اُس نے دیکھا بعید و قریب
نہ آیا کوئی دور تک جب نظر
چلا اک طرف راہ سے بے خبر
ابھی اِتنی طاقت نہ تھی پاؤں میں
ارادہ تھا پہنچوں کسی گاؤں میں
یہی کوششیں تھیں کہ شب ھوگئی
ھر اک منزلِ آب و گِل سوگئی
صدائیں درندوں کی آنے لگیں
بھیانک فضائیں ڈرانے لگیں

ہر اک سمت تاریکیاں چھا گئیں
گھٹائیں امنڈتی ہوئی آ گئیں
اندھیرے سے جی اور گھبرا گیا
سماں پھر طلاطم کا یاد آ گیا
اِدھر بھوک سے ہو رہا تھا نڈھال
اُدھر پیاس سے زندگی تھی وبال
مگر پھر مقدّر ہوا مہرباں
نظر آئی ندّی وہیں اک رواں
پیا اس نے جی بھر کے وہ آبِ سرد
سکوں سے بدلنے لگا سوز و درد
سنبھالا یہ کہہ کہہ کے قلبِ حزیں
یقیناً ہے یہ ہند کی سر زمیں
کہیں کوئی بستی نظر آئیگی
وطن کی بھی اب راہ مل جائیگی
رہا وہ اِسی طرح گرمِ سفر
کہیں شام تھی اور کہیں تھی سحر
کئی بار کاٹی درختوں پہ رات
وہ کھا پی لیا جو ملا ساگ پات

کبھی سامنا کوهساروں کا تھا
کہیں سلسلہ مرغزاروں کا تھا
نظر آئے شاداب گلشن کبھی
الجھتا تھا کانٹوں میں دامن کبھی
ملے سبز کھیتوں کے منظر کہیں
زمیں دور تک پائی بنجر کہیں
مناظر دلاویز تھے بیشتر
اچٹتی سی پڑتی تھی لیکن نظر
طبیعت پہ چھائی ہوئی تھی جو یاس
تو رهتا تھا شام و سحر جی اداس
جہاں اور نظامِ جہاں تھا وهی
زمیں تھی وهی آسماں تھا وهی
مگر اس کی اگلی سی حالت نہ تھی
وہ دل هی نہ تھا وہ طبیعت نہ تھی
اسی میں کہ تھی نرم موج هوا
اسے ایک شاداب میداں ملا
زمیں جس کی سرسبز و هموار تھی
جہاں آتشِ گل شرر بار تھی

وہ خود روشگوفے چمن در کنار
پہاڑوں سے گرتے ہوئے آبشار
مچلتے ہوئے سبزہ زاروں میں کچھ
اُلجھتے ہوئے شاخساروں میں کچھ
چٹانوں پہ اک شور کرتے ہوئے
ہواؤں کے بل پر نکھرتے ہوئے
رواں تنگ راہوں میں تھے تیز تیز
کُھلی وادیوں میں کبھی جست و خیز
وہ جنگل میں قدرت کی فیاضیاں
زمیں سبز تھی نیلگوں آسماں
سماں تھا وہ نظارہ پرور یہاں
کہ ٹِھٹکا جسے دیکھ کر کامراں
تھپکنے لگی پھر ہوا شام کی
ہوئی فکر اب اِس کو آرام کی
طبیعت نے پائی جو راہِ سکوں
رگوں میں ہوئی سُست رفتارِ خوں
مگر کوئی بستی نہ تھی آس پاس
یہ دیکھا تو ہونے لگا جی اداس

وہ جنگل وہ تنہائیاں اور وہ رات
فقط کامراں یا خدا کی تھی ذات
کہ ناگاہ جنگل میں کچھ دور آدھر
آسے روشنی سی اک آئی نظر
کچھ ایسا نظر آرہا تھا سماں
کہ جُنبش میں جیسے ہوں پرچھائیاں
بڑھا دل میں یہ سوچکر کامراں
کہ دیکھو تو کیا ہو رہا ہے یہاں
قریب آسکے پہنچا ٹہلتا ہوا
دبے پاؤں آہستہ چلتا ہوا
نگاہوں سے بچنا جو منظور تھا
وہ اک نخل کی آڑ میں چھپ گیا
نظر آئے کچھ آسکو انساں وہاں
کوئی سرنگوں تھا کوئی شادماں
کوئی پیر تھا کوئی مست شباب
لئے تھے وہ ناقوس وچنگ ورباب
یہ جنگل میں پوجا کا سامان تھا
کئی چومکوں سے تھی روشن فضا

کئی تھال پیتل کے تھے متصل
کسی میں تھا گُوگل کسی میں تھے تِل
کوئی پیر اپنے جگاتا ہوا
بھجن جھانجھہ پر کوئی گاتا ہوا
غریبوں کی دھج سادھوؤں کی ادا!
جبینوں پہ قشقے سروں پر جٹا
نمایاں مگر ان میں تھا ایک فرد
غریب ونحیف و دل افگار و زرد
بہت مرد وزن یوں تو تھے آس پاس
مگر ایک عورت تھی تصویرِ یاس
قریب اسکے تھی اور اک حور وش
جسے دیکھکر ہوں فرشتے بھی غش
خطوطِ شفق حسرتِ شامِ غم
وہ اس حسن دلکش میں دیکھے بہم
شرافت سے رخشاں جبین بلند
فسوں ساز آنکھیں مگر درد مند
نظر داستان قلب ناشاد کی
وہ انداز لے جن میں فریاد کی

وہ لہجہ میں عصمت کی بیباکیاں
وہ سُلجھا ہوا اُس کا طرزِ بیاں
عجب رُخ پہ عالم دکھاتا تھا رنگ
اک آتا تھا اور ایک جاتا تھا رنگ
جوانِ سادھوؤں میں تھا سب کا گُرو
قریب اُسکے بیٹھی تھی وہ خوبرُو
جُھکائے ہوئے زانوئے غم پہ سر
بہت سہمی سہمی تھی اُسکی نظر
اُٹھاتی تھی سوئے فلک یوں نگاہ
خدا سے ہو جیسے کوئی داد خواہ
غرض جب ہوا منتر اُس کا تمام
گُرو اُس سے کرنے لگا یوں کلام
کہ لے باندہ ڈورا بڑھا اپنا ہاتھ
جبین پر یہ ٹیکا لگا اِس کے ساتھ
جلادونگا جو تیرے سر پر ہے بھوت
ابھی اپنی ”شکتی“ کا دونگا ثبوت
اِدھر دوسری وہ زنِ غم نصیب
جو بیٹھی تھی اِس نازنیں کے قریب

بڑے درد سے کر رہی تھی فغاں
وہ معلوم ہوتی تھی لڑکی کی ماں
گُرو سے وہ کہتی تھی فریاد سے
یہی میری لے دیکے اولاد ہے
مجھے جان کا اِس کی ہوتا ہے ڈر
ترے پاؤں پڑتی ہوں جادو نہ کر
بلا سے رہے اِسکے سر پر یہ جن
بلا سے کٹیں فکر میں رات دن
یہ سُنکر بہت وہ ہوا خشمگیں
ہوئی اور تاریک اُس کی جبیں
کہا اِس قدر غُل مچاتی ہے کیوں
تڑپتی ہے کیوں تلملاتی ہے کیوں
تجھے میں یہ سمجھا چکا بار بار
کہ اک جن ہے لڑکی کے سر پر سوار
نہیں تو کُھلا اس پہ کیونکر یہ راز
کہ روزہ ہے کیا چیز اور کیا نماز
بگڑ کر کہی اس نے یہ بات جب
ملانے لگے ہاں میں ہاں اور سب

غرض ماں نے مجبور ہوکر کہا
کہ لے تارا ماتھے پہ ٹیکہ لگا
وہ بولی دکھایا یہ قسمت نے دن
کوئی بھوت ہے میرے سر پر نہ جن
لگاؤں گی میں تو نہ ٹیکہ کبھی
نہ ہوگا یہ مجھ سے نہ ہوگا کبھی
گُرو نے کہا سُن کے یہ گفتگو
یہ جن باتیں کرتا ہے یوں دوبدو
میں اِسکو جلا کر رہوں گا ضرور
میں اس جن پہ قبضہ کرونگا ضرور
ہوا یہ ارادہ جو اُس کا عیاں
یہ بولا انہیں میں سے اک ناتواں
میں خودھی دُکھی ہوں دَیا کیجئے
بس اب اور مجھکو نہ دُکھ دیجئے
یہ مانا نصیبوں کی ھیٹی ہے یہ
مگر ایک ھی میری بیٹی ہے یہ
مرا گھر اِسی سے تو آباد ہے
مرا دل اِسی کے سبب شاد ہے

کہیں ہو نہ جائے اسے اور کچھ
کہ بدلے نظر آتے ہیں طور کچھ
میں باز آیا منگنی سے سُن لیں یہ سب
یہ رِشتہ نہیں مجھکو منظور اب
مِرے مَن کا سُکھ میری تارا کبھی
جو ہَر کی دَیا سے سُکھی ہوگئی
تو پھول اِس کے سہرے کے کھل جائینگے
مجھے اَور بر اِس کے مل جائینگے
یہ سُن کر بڑھا اور اک تند خو
لگا کہنے بکواس کرتا ہے تو
یہ منگنی سے پہلے تھی بیٹی تری
منگیتر ہے اب تو مرے پُتر کی
یہ ناتا کبھی چھوٹ سکتا نہیں
یہ رشتہ کبھی ٹوٹ سکتا نہیں
نکالی ہے کیا اپنے مطلب کی راہ
کہیں اب نہیں اس کا ممکن بیاہ
گُرو کو میں لایا ہوں منت کے ساتھ
کَبھی گھر نہ جاؤنگا اب خالی ہاتھ

لیا ہاتھ پھر اُس نے لڑکی کا تھام
وہ کہنے لگے مل کے سب رام رام
اکیلا تھا بوڑھا نہ کچھ کر سکا
کلیجہ مگر تھام کر رہ گیا
پڑی تھی وہ ایسوں کے پالے غریب
کسی کے نہ اِس طرح پھوٹیں نصیب
اُسے لیگئے اک شجر کے قریں
بٹھا کر وہاں اُسکی مُشکیں کَسیں
وہ دست ستم اور وہ نازک بدن
خزاں تھی حریفِ بہارِ چمن
نگاہوں میں بادل سے گھرتے رہے
وہ پڑہ پڑہ کے کچھ گِرد پھرتے رہے
نہ تھا کوئی چارہ گرِ بیکسی
قیامت کا تھا منظرِ بیکسی
اداسی وہ چہرہ پہ چھائی ہوئی
اجل جیسے ہو سر پہ آئی ہوئی
نہ طاقت اُسے ضبط بیداد کی
نہ ہمت اُسے آہ و فریاد کی

اجازت جگہ چھوڑنے کی نہ تھی
سکت ہاتھ بھی جوڑنے کی نہ تھی
وہ مجروحِ غم کُشتۂ بیکسی
نگاہوں سے بس طالبِ رحم تھی
مخالف تھے سب کون کرتا مدد
کہ آئی بلا سر سے ہوجائے رد
یہ تھا خوف سے حال ماں باپ کا
کہ دم مارنے کا بھی یارا نہ تھا
گُرو نے یہ کہہ کر کیا مطمئن
سحر تک اتر جائے گا اِس کا جِن
غرض ہوگئیں جب یہ رسمیں تمام
اڑانے لگے سب شراب و طعام
ہوا سرد تھی نیند آنے لگی
شراب اور عالم دکھانے لگی
اِدھر سخت بے چین تھا کامراں
ہراك سانس اب ہورہی تھی گراں
سمجھ میں نہ آتا تھا کچھ کیا کرے
کہاں تک یہ بیداد دیکھا کرے

سُجھاتی تھی رہ رہ کے یہ احتیاط
کہ اتنوں میں تنہا تری کیا بساط
جو تجھ پر بھی وارِ ان کا چل جائیگا
جو موقع ہے وہ بھی نکل جائیگا
مگر اِن پہ جب بیخودی چھا گئی
بڑھا نشہ اتنا کہ نیند آ گئی
کہا عقل نے ہاں یہ ہنگام ہے
جو منظور تجھکو یہی کام ہے
بڑھا آخرِ کار اب کامراں
لئے دل میں آمید کا اک جہاں
اسیرِ ستم نازنیں تھی خموش
نہ غیروں کا تھا اور نہ آپے کا ہوش
حق انسانیت کے ادا کر دئے
گرہ کھولدی بند وا کر دئے
ٹھہرنا جو اس جا مناسب نہ تھا
اُٹھا کر اسے دوش پر چل دیا
کچھ آگے پہاڑوں میں اک غار تھا
گزر اس میں ہرچند دشوار تھا

کسی طرح لیکن وہ پہنچا وہاں
ہوا مطمئن اب دلِ کامراں
زمیں پر آتارا آسے جس گھڑی
ہوئی جیسے طے کوئی منزل کڑی
وہ چہرہ پہ ناشاد کے نور تھا
اُجالا سا ظلمت میں ہونے لگا
حدیثِ الم مختصر ہوگئی
ابھی رات تھی یا سحر ہوگئی
ہوا مرحلہ جب یہ اِس طرح طے
تو سوچا کہ دیکھو تو جیتی بھی ہے
کبھی سانس اور نبض دیکھی کبھی
اِدھر سے ہوا مطمئن اس کا جی
تردّد یہ تھا کیا کیا جائے اب
اِسے ہوش میں کس طرح لائے اب
غرض چند پتّوں کو پھر موڑ کے
وہ لے آیا پانی کسی نہر سے
دئے اُس نے چھینٹے جو پھر بار بار
تو وہ غش سے ہونے لگی ہوشیار

نیا تھا جو منظر نئی واردات
یکایک سمجھ میں نہ آئی یہ بات
کدھر وہ مصیبت کی دنیا گئی
کہاں تھی ابھی اور کہاں آ گئی
پڑی کامراں پر کچھ ایسی نظر
محبت کی ہو جیسے پہلی نظر
حیا رُخ پہ چھائی جھجھکنے لگی
وہ ہر سَمت حیرت سے تَکنے لگی
نمایاں نگاھوں سے تھا اضطراب
وہ سمجھی کہ شائد یہ ھے کوئی خواب
یہ دیکھا تو کہنے لگا کامراں
کوئی دشمنوں میں نہیں ھے یہاں
بہ فضلِ خدا غم سے بدلا سرور
وہ آفت ھوئی اسکی رحمت سے دور
کرو شُکر اسکا جو ھے کارساز
کہ وہ ھے بہرحال بندہ نواز
مصائب میں بھی راز ھیں کچھ نہاں
بہار آفریں ھے چمن میں خزاں

مصیبت سے جب آزماتا ہے وہ
تو انسان کو انسان بناتا ہے وہ
یہ باتیں وہ کچھ دیر کرتا رہا
ادھر نقشِ تسکین ابھرتا رہا
ذرا کم ہوا دل سے حساسِ غم
نہ وحشت رہی اور نہ خوفِ ستم
کیا اس نے پھر اٹھ کے شکرِ خدا
یہ دیکھا تو دل کامراں کا بڑھا
کچھ اپنی مصیبت سُنائی اسے
جو گذری تھی حالت بتائی اسے
وہ کہتا رہا اور یہ سُنتی رہی
محبت کے پھولوں کو چُنتی رہی
یہ پھر باتوں باتوں میں اس نے کہا
مری بات کا گر نہ مانو بُرا
کرو تم بھی کچھ اپنا قصّہ بیاں
کہ تم کون ہو اور وطن ہے کہاں
تمہیں اِن کا کیوں کر کہوں نورِ عین
یہ وحشی تمہارے نہیں والدین

تمهارا الگ ان سے انداز ہے
ضرور اس میں پنہاں کوئی راز ہے
یہ سُنکر ہوئی اس طرح لب کُشا
حیات آفریں جیسے موجِ صبا
فلک کی ہوں میں بھی ستائی ہوئی
مصیبت کے طوفاں میں آئی ہوئی
میں ہوں آپ کی طرح صرفِ محن
مسلماں ہوں دہلی ہے میرا وطن
کبھی میرے والد بھی تھے ذی وقار
لُٹی گرچہ وہ خاندانی بہار
پریشان گو اب تباہی سے ہیں
مگر مغلیہ نسلِ شاہی سے ہیں
خدا کے بھی ہیں کارخانے عجیب
میں ایک اُن کی اولاد ہوں بدنصیب
مجھے عیش ہی سے سروکار تھا
بڑے لاڈ میرے بڑا پیار تھا
ہمارا چمن تھا سراپا بہار
یکایک مخالف ہوا روزگار

یہیں تک یہ پہنچا تھا قصّہ ابھی
کہ جی اُس کا بھر آیا رونے لگی
ستارے سے پلکوں پہ کچھ آ گئے
زباں رُک گئی ہونٹ تھّرا گئے
کہا کامراں نے ہراساں نہ ہو
خدا کے لئے یوں پریشاں نہ ہو
بدل کر رہیں گے یہ لیل و نہار
پھر آئے گی اک دن چمن میں بہار
میں ہر چند خود ہوں رہینِ ستم
اسیرِ بلا کُشتۂ رنج و غم
نہیں مجھ سا گُم کردہ منزل کوئی
کوئی ناخدا ہے نہ ساحِل کوئی
مگر یہ عقیدہ ہے مُحکم مرا
کہ حامی ہے آفت زدوں کا خدا
یہ حالت بھی اِک دن بدل جائیگی
گھڑی رنج و حرماں کی ٹل جائیگی
سُنے جب یہ الفاظ تسکیں فِزا
اُدھر جی بھی رونے سے ہلکا ہوا

سنبھلنے لگا کچھ دل ناتواں
کئے خشک آنچل سے اشکِ رواں
یہ کہنے لگی اس سے پھر وہ حزیں
کہ ماضی کا احساس مٹتا نہیں
کرونگی غم اپنا بیاں پھر کبھی
سُناوں گی یہ داستاں پھر کبھی
مصائب نے کر دی ھے حالت خراب
قیامت کا ھے روح میں پیچ و تاب
بہت گرچہ مُشتاق تھا کامراں
مگر اسکو دیکھا جو یوں نیم جاں
ھوا قدرتاً دل میں پیدا خیال
ذرا اور گھٹ جائے رنج و ملال
زمانہ ھے خود درد دل کا طبیب
کبھی پھر سُنیں گے یہ قصّہ عجیب
پھر اس نے کہا مُسکرا کر کہ ھاں
یہ قصّے تو ھوتے رھیں گے بیاں
بہت تھک گئی ھوگی سو جاؤ تم
کسی طرح دل میں نہ گھبراؤ تم

یہ سُنکر وہ کہنے لگی خوش خِصال
طبیعت تو میری بھی ھے گو نِڈھال
مگر آپ کے دُکھ بھی ھیں بے قیاس
سفر خستگی ماندگی بھُوك پِیاس
خدارا اب آرام فرمائیں آپ
میں سو جاؤنگی پہلے سو جائیں آپ
سفر میں ھے کیا کام آرام کا
یہ آرام بھی ھے فقط نام کا
ملے گا سُکون وہ بھی دن آئینگے
مگر جب وطن ھم پہنچ جائینگے
یہ باتیں دل آویز تھیں اسقدر
کہ بُھولا وہ ناشاد رنجِ سفر
نظر یك بیك مُسکرانے لگی
اُمید اپنا چہرہ دِکھانے لگی
مَسرّت سی اِك قلب پر چھا گئی
خدا جانے کس کس کی یاد آ گئی
مگر ساتھ ھی ابر غم گھِر گیا
نگاھوں میں اَگلا سماں پھِر گیا

مُجسّم کبھی تھا خیال پدر
کبھی ماں کی تصویر پیشِ نظر
کبھی باپ کو اس نے پایا حزین
کبھی ماں کو مغُموم واندوہ گیں
کہ جیسے وہ کہتی ہے بادرد و آہ
مجھے کردیا ہائے غم نے تباہ
مرے دل کا ٹکڑا وہ گبرو جواں
کدھر ہے کہاں ہے مرا کامراں
الٰہی یکایک یہ کیا ہوگیا
مرا لال مجھ سے جُدا ہوگیا
اِسی دُھن میں خاموش تھا کامراں
نگاہوں سے آثارِ غم تھے عیاں
بڑھا درد آنسو ٹپکنے لگے
جو تھے دل میں کانٹے کھٹکنے لگے
یہ دیکھا تو بولی وہ با چشمِ تر
پریشان ہو یوں آپ سا باخبر
ابھی خود ہی بہلا رہے تھے مجھے
ابھی آپ سمجھا رہے تھے مجھے

بس اب کچھ نہ ارشاد فرمائیے
بہت آچکی رات سو جائیے
دِلوں کا سہارا خُدا کی تھی ذات
کٹی آنکھوں آنکھوں میں آخر یہ رات
وہ شب کو جو تھا خوف جاتا رہا
اٹھے اور اِک سمت رستہ لیا
خیالِ وطن سے بہلتے رہے
اِسی شوق میں راہ چلتے رہے



چِھڑا ایک دن پھر جو ذکر وطن
کہا کامراں نے بہ طرزِ حسن
تم آخر ہوئیں کیوں اسیرِ بلا
کہا مجھسے اب تک نہ یہ ماجرا
یہ سُنتے ہی وہ دم بخود ہوگئی
خدا جانے کس فکر میں کھو گئی
کِیا پھر یہ اِک آہ بھر کر بیان
عجب داستاں ہے میری داستاں

۱۰۳۶

یہ پہلے بھی شائد ہے میں نے کہا
مجھے واسطہ کوئی غم سے نہ تھا
خوشی میں گزرتی تھی اک اک گھڑی
کبھی کاھیکو تھی مصیبت پڑی
یکایك مخالف ہوا آسماں
بلا میں ہوئی مُبتَلا ناگہاں
وطن میں ہیں والد کے اک غمگسار
ہے اَشراف دھلی میں جن کا شُمار
سبھی پر یہ حال آشکارا بھی ہے
محبت بھی ہے بھائی چارا بھی ہے
وہیں سے یہ اِک روز آئی خبر
کہ دعوت ہے احباب کی اُن کے گھر
زنانے میں مدعُو ہیں سب بی بیاں
یہاں سے بھی سب کی طلب ہے وہاں
ہوا دردِ سر اِک بہانا مجھے
اُسی دن حرارت تھی آنا مجھے
جو امّی نے دیکھی یہ حالت مری
کہ اچھی نہیں ہے طبیعت مری

کہا مجھ سے بی بی رہو تم یہیں
تمھیں لیکے جانے کا موقع نہیں
وہ خود بھی نہ جاتیں مگر تھا خیال
کہ شاید ہو آپس میں پیدا ملال
نہ سوچیں کہیں دل میں یہ میزباں
ہماری خوشی انپہ ہے کچھ گراں
ادھر مجھکو یہ ضد کہ میں جاؤنگی
اکیلی تو کچھ اور گھبراؤں گی
وہ بولیں سُنی ہے بڑی دھوم دھام
بہت کشمکش ہے بڑا اژدہام
طبیعت نہ کچھ اور بگڑے وہاں
یہ گھر کی سی راحت ملیگی کہاں
کسی کو بھی لیکن نہ تھا یہ گُماں
کہ ہے تاک میں گردشِ آسماں
یہی احتیاط اِک ستم ڈھائے گی
گھڑی بھر میں دنیا بدل جائیگی
گئی ہوتی اے کاش میں آنکے ساتھ
مگر ساری باتیں ہیں قسمت کے ہاتھ

کسی کا ہے کیا زُور تقدیر پر

کسی کو بھلا غیب کی کیا خبر

یہ ہے شہر بھر میں ہر اِک پر عیاں

بہت خُوشنما ہے ہمارا مکاں

مگر تھی کچھ اس دن عجب بیکسی

فقط میں تھی اور ایک انّا مِری

ہَر اِک سَمت تھی اِک اداسی عیاں

ہم اندر تھے باہر فقط پاسباں

سرِ شام دل کو سُکوں سا ہوا

طبیعت ٹھکانے ہوئی جب ذرا

تو بولی یہ انّا جو بیٹھی تھی پاس

مری جان کب تک رہوگی اداس

نمایاں ہے چہرہ سے اَبتک ملال

میں صدقے بتاؤ تو کچھ دِل کا حال

بہت ڈَھل گیا دن تپِش کم ہوئی

چلو اٹھ کے باہر کہ بَہلے گا جی

حرارت بھی کچھ ہو چَلی تھی جو کم

ہوئی ہاتھ منہ دھو کے میں تازہ دم

مگر اب مرے دل میں تھا یہ ملال
کہ امّی کو آیا نہ کچھ بھی خیال
گئیں تھیں یہ کہکر کہ جلد آؤں گی
ترے بِن تو میں خود بھی گھبراؤں گی
ڈھلی دوپہر شام بھی ہو چلی
وھاں جا کے جھوٹوں خبر بھی نہ لی
یہ احساس ہوتے ھی میں نے کہا
کہ "اچھی" ذرا جا کے تو دیکھنا
یہ امّی ابھی تک نہ واپس ہوئیں
کوئی اِسطرح بھولتا ھے کہیں
جواب بھی ارادہ نہ آنے کا ہو
تو میں بھی چلی آوں نا پوچھ لو
یہ سُن کر وہ پہلو بچانے لگی
وہ باتوں میں مجھکو لگانے لگی
کہ جانا تو ہوتا ھے اپنی خوشی
اجازت پہ موقوف ھے واپسی
وہ دن رات تم پر چِھڑکتی ھیں جان
نہ ہو ماں کی جانب سے یوں بدگمان

آنہوں نے تو کی ہو گی جلدی ضرور
یہ سب روکنے والوں کا ہے قصور
میں تنہا تمہیں چھوڑ کر جاؤں گی
نہ بی بی یہ چونڈا نہ منڈواؤں گی
میں رونے لگی مجھکو ضد آ گئی
یہ دیکھا تو اَنّا بھی گھبرا گئی
نہ کچھ بن پڑا تاؤ کھاتی آ تھی
بڑے طیش میں بڑبڑاتی آ تھی
نکل کر اُدھر گھر سے اَنّا گئی
اِدھر میں دریچہ کے پاس آ گئی
حویلی کے نیچے ہی تھی رھگذر
گزرتے تھے رھرو اِدھر سے اُدھر
جدھر دیکھئے بھیڑ سی تھی لگی
انہیں سب میں اک پھول والی بھی تھی
صدا دے رہی تھی وہ ڈلیا لئے
کہ پیسہ میں دو دو ھیں گجرے دئے
یہ چمپے کی لڑیاں یہ جوھی کے ھار
ٹکے میں بنا لو بنی کا سنگھار

چلو آؤ جانے کو ہے یہ بہار
کہیں ایسے سستے ملیں گے نہ ہار
پسند اس کی آواز آئی مجھے
رسیلی صدا دل سے بھائی مجھے
یکایک پڑی اس کی مجھ پر نظر
میں چلاّئی او پھول والی اِدھر
نظر سے نظر وہ ملاتی بڑھی
بڑی شوخ تھی مُسکراتی بڑھی
مگر جب مکاں میں وہ آنے لگی
سَرا پردۂ در اُٹھانے لگی
تو بڑھکر مزاحم ہوا پہرہ دار
اجازت نہ دی آنے کی زینہار
کہا میں نے یہ ہے بُلائی ہوئی
اجل تو نہیں سر پہ آئی ہوئی
نہ پہرہ نہ دربان ٹوکے اِسے
خبردار ہرگز نہ روکے اِسے
یہ سُن کر اِدھر گھر میں وہ آ گئی
اُدھر مجھ پہ حیرت سی اک چھا گئی

بزرگوں سے میں نے سُنی تھی خبر

که هم شکل ہوتے نہیں دو بشر

مگر یه نئی شانِ تقدیر تھی

که وه ہو بہو میری تصویر تھی

میں کچھ خوش ہوئی کچھ پریشاں ہوئی

بہت قدرتِ حق په حیران ہوئی

جب آئینه کے سامنے آگئی

میں ھنسنے لگی اور وہ شرما گئی

اگر فرق کچھ تھا تو بس اِسقدر

کہ وہ زیب و زینت سے تھی بے خبر

وہ باتوں کے انداز سُلجھے ہوئے

پریشاں نظر بال اُلجھے ہوئے

زباں بھی گنوارو نہ تھی صاف تھی

تمیز اُس کو تھی شین اور قاف کی

وہ تھی عیش و راحت سے نا آشنا

اثر صاف تھا رُخ په اِفلاس کا

مگر تھی بڑی چُلبُلی شوخ و شنگ

غضب کی ادائیں قیامت کے ڈھنگ

نہ رُخ پر اُداسی نہ غم آس پاس
اگرچہ "غریبا مئو" تھا لباس
کیا میں نے دریافت نام اور مقام
تو کہنے لگی ہنس کے تارا ہے نام
مری ماں بھی موجود ہے باپ بھی
یہیں باغِ شاہی میں ہے جھونپڑی
ہنسی بھولی باتوں پہ آتی رہی
میں کچھ دیر ہنستی ہنساتی رہی
یکایک مجھے پھر یہ آیا خیال
مگر یہ بھی تھی اک مُقدّر کی چال
کہ پہنوں تو اُس کا ذرا میں لباس
کروں اِس سے اندازۂ التباس
اُسے اپنی پوشاک پہناؤں میں
اِسی کھیل میں جی کو بہلاؤں میں
جو یوں وضع اُس کی بدل جائیگی
تو بالکل ہی مجھ سی نظر آئیگی
یہ بات اُس سے جس وقت میں نے کہی
تو بیساختہ وہ بھی ہنسنے لگی

غرض اپنے کپڑے پنہائے آسے
چلن شہریوں کے سکھائے آسے
میں خود بھر کے روپ آس کا مالن بنی
وہ میلا سا لہنگا پھٹی اوڑھنی
لگائی صدا لیکے پھر ٹوکری
قیامت ہے بیلے کی چمپا کلی
خود اپنی نظر میں نرالی تھی میں
کہ بس ہو بہو پھول والی تھی میں
اِس انداز سے دیرھی تھی صدا
کہ میرا مکاں جیسے بازار تھا
حقیقت میں تھا اِس کا مقصد ھی کیا
سوا کھیل کے اور کچھ بھی نہ تھا
بظاہر کسی کو نہ تھا کچھ گزند
نہ آیا مُقدّر کو لیکن پسند
خوشی کا سماں خاك میں مل گیا
ملی ناسپاسی کی مجھکو سزا
ابھی میں اِسی کھیل میں محو تھی
یکایك سواری کی آمد ھوئی

جب اماں کے آنے کا وقت آگیا
تو دربان پھاٹک پہ گھبرا گیا
ڈرا وہ کہ مجھ پر نہ ہو کچھ عتاب
کہیں مجھ سے مانگا نہ جائے جواب
کہ کیوں پھول والی کو آنے دیا
زنانے میں کیوں میں نے جانے دیا
آدھر پہرے والے نے دی یہ صدا
اری پھول والی نکل بھاگ جا
ادھر میرے بگڑے ہوئے تھے نصیب
چلی آئی میں آپ در کے قریب
یہ مطلب تھا وہ بھی پریشان ہوں
مجھے دیکھیں اماں تو حیران ہوں
مری اسکی صورت جو تھی ایک سی
وہ سمجھا کہ ہے پھول والی یہی
کچھ اس بھیس نے اور دھوکا دیا
مجھے کھینچکر اس نے باہر کیا
پڑی تھی جو مجھ پر مصیبت نئی
میں اس ناگہانی سے گھبرا گئی

کہا میں نے گھبرا کے یہ بار بار
کہ میں پھول والی نہیں زینہار
مگر اس کو آیا نہ اصلا یقیں
کہا اس نے میں ماننے کا نہیں
مرے سامنے تو گئی تھی ابھی
ان آنکھوں میں کیوں خاک ہے جھونکتی
عجب چیز ہے یہ شرافت کا ظرف
نہ نکلا زباں سے مری کوئی حرف
ادھر پھول والی بھی گھبرا گئی
وہ سمجھی مصیبت کوئی آ گئی
نگوڑی نے مجھ پر کیا یہ ستم
وھیں رہ گئے جم کے اس کے قدم
سپاھی مجھے کھینچتا لے چلا
مکاں سے مرے دور پہنچا دیا
کھڑی رہ گئی اک جگہ میں خموش
محلہ سے واقف نہ راھوں کا ھوش
مگر دفعتاً مجھکو آیا خیال
کہ آتی پہ کھل کر رہے گا یہ حال

یہ سوچا تو کچھ دِل کو ڈھارس ہوئی
سرِ راہ ناچار بیٹھی رہی
یقیں تھا کہ یہ بھید کُھل جائے گا
کوئی گھر سے لینے ضرور آئے گا
یکایک اک آواز میں نے سُنی
بلاتا ہو تارا کو جیسے کوئی
نہ پلٹی تھی اب تک جو تارا موئی
تو ماں ڈھونڈھتی ڈھونڈھتی آئی تھی
مجھے دم بخود پا کے جَھلاّ گئی
گَرجتی ہوئی بڑھ کے پاس آ گئی
کہا اُس نے پھر مُجھ سے چل جانہار
یہاں کس کا کرتی ہے تو انتظار
ہوئی رات چھایا اندھیرا مگر
نہ گھر کی خبر ہے نہ راہوں کا ڈر
یہ گجرے بھی ہیں ٹوکری میں بھرے
ارے سب ہیں جیسے کے تیسے دھرے
کہا میں نے اُس سے کہ سُن نیک بخت
مری جان پر خود مصیبت ہے سخت

کوئی ماں بھی ہوتی ہے انجان کیا
نہیں تجھکو بیٹی کی پہچان کیا
سُنایا سرے سے وہ قصّہ تمام
بتایا اُسے اپنا نام و مقام
پھر اُس سے یہ کی میں نے خواہش کہ جا
یہاں سے کچھ آگے مکاں ہے مرا
وہیں تیری بیٹی ملے گی تُجھے
اُسے نام لیکر تو آواز دے
وہ پہلے تو جھجکی مرے طور سے
مجھے اُس نے دیکھا بڑے غور سے
حقیقت کو سمجھی نہ اُس کی نظر
میں تارا سے ملتی تھی کچھ اِسقدر
وہ سمجھی کہ آسیب کا ہے خلل
جبھی تو یہ باتیں بھی ہیں بے محل
بہت ہی پریشان ہونے لگی
بڑھا وہم اتنا کہ رونے لگی
اِدھر راہ چلتوں نے دیکھا یہ حال
ہراک کی زباں پرنیا تھا سوال

کہا میں نے گھبرا کے چل گھر کو چل
مجھے مل گیا میری کرنی کا پھل
مصیبت نہ ٹالے سے آخر ٹلی
وہ تارا سمجھکر مجھے لے چلی
میں کاہیکو پیدل چلی تھی کبھی
یہ آفتاد تھی میرے سر پر نئی
میں پہنچی غرض گرتی پڑتی وہاں
شکستہ سی اک جھونپڑی تھی جہاں
کھڑا تھا وہاں غیظ میں باغباں
نکلتی تھی آنکھوں سے چنگاریاں
وہ ,,ڈکرایا،، جیسے غضبناک بیل
کہاں مرگئی تھی بتا تو چڑیل
نہ جانے وہ کیا اور دیتا سزا
اُسے کیا خبر وہ تو دھوکے میں تھا
ملی اُس سے مالن کے ہاتوں نجات
سُنانے لگی پھر وہ سب واردات
مرا حال اُس پر عیاں کر دیا
سُنا تھا جو مجھ سے بیاں کر دیا

سُنی اُس نے مجھ سے بھی سب داستاں
کیا میں نے خود سارا قِصّہ بیاں
سمجھ میں نہ آتی تھی آسکے یہ بات
کچھ ایسے اچھنبے کی تھی واردات
مری کوششیں سب رھیں نا تمام
یہاں بھی بِگاڑا شباھت نے کام
بہت دیر تک سر کَھپاتی رھی
مُسلسل کہانی سُناتی رھی
نہ روداد میری ھوئی دل نشیں
کسی طرح آیا نہ اُس کو یقیں
غرض ھر طرف پھر ھوئی یہ پُکار
کہ جن ھے کوئی میرے سر پر سوار
بہت دیکھنے لوگ آنے لگے
مجھے چھیڑنے اور ستانے لگے
میں رو رو کے کرتی تھی ھر دم دعا
مصیبت مری دور کر اے خدا
نتیجہ سمجھ میں کچھ آتا نہ تھا
یہی سوچتی تھی کہ ھوتا ھے کیا

اِسی طرح گزرا مجھے ایک سال
کہ ہر سانس تھی زندگی کی وَبال
سمجھتے تھے مجھکو جو بیمار وہ
تو کچھ اور کرنے لگے پیار وہ
نہ تھی اور اولاد آن کی کوئی
مری طرح تارا اکیلی ھی تھی
اِسی سے تھی آن کو محبت بہت
نمایاں تھی دونوں کی شفقت بہت
بڑھی شُہرت آسیب کی اسقدر
منگیتر کو تارا کے پہنچی خبر
وہ سُنتے ھی یہ حال گھبرا گئے
عزیز آن کے جتنے تھے سب آ گئے
وہ دھلی میں ٹھیرے بہت دن مگر
ہوئی کوئی صورت نہ جب کارگر
نئی راہ تدبیر کی پا گئے
وہ ہم سب کو لیکر یہاں آ گئے
گُرو تھا جو آن کا بلایا گیا
آسے ماجرا سب سُنایا گیا

کہا اُس نے یہ کیا بڑی بات ہے
یہی کام میرا تو دِن رات ہے
پلک مارتے جِن کو ماروں گا میں
اِسے بات کرتے اُتاروں گا میں
مرا دل یہ سُنتے ہی تھرّا گیا
بڑھا خوف اتنا کہ غش آ گیا
پھر آخر میں جو ظلم مجھ پر ہوئے
وہ سب کچھ ہیں دیکھے ہوئے آپکے
یہاں میں ہوں گھر میں ہے تارا مکیں
وہاں بھی کسی پر یہ ظاہر نہیں
مجھے اِبتدا سے ہے یہ اِحتمال
اُدھر بھی نہ آسیب کا ہو خیال
سُنا کامراں نے جو یہ ماجرا
تحیُّر کی اُس کے نہ تھی اِنتہا
کیا اُس نے یہ اپنے دل میں خیال
مشیّت کو سمجھے یہ کِسکی مجال
کہاں یہ امیروں کی نورِ نگاہ
کہاں یہ گدایانہ حالِ تباہ

کچھ ایسی اہم تو نہ تھی واردات
فسانہ بنی بڑھ کے اِتنی سی بات
پھر اُس سے یہ کہنے لگا کامراں
بڑی روح فَرسا ہے یہ داستاں
تمہاری یہ بے تابیاں ہیں درست
یہ آنسو یہ بے خوابیاں ہیں درست
لبوں پر رہے کیوں نہ ہر وقت آہ
اُٹھائے ہیں تم نے ستم بے پناہ
مجھے رہرووں سے ملا ہے پتا
کہ ہے بمبئی کا یہی راستا
یہ ممکن ہے دہلی چلے جائیں ہم
حقیقت اُنہیں جا کے سمجھائیں ہم
بتائیں کہ قسمت کا مارا ہے کون
کہ تم کون ہو اور تارا ہے کون
مگر ڈر یہ ہے اور بگڑے نہ بات
نیا رنگ پکڑے نہ یہ واردات
وہاں فتنہ پرداز ٹھہروں نہ میں
کہ والد تمہارے تو دھوکے میں ہیں

مرے پاس ہے یہ جو انگشتری
نگینے ہیں اِس کے بہت قیمتی
اِسے چل کے بیچیں گے پہلے وہاں
سکونت میں ہوں تا کہ آسانیاں
یہ سوچا ہے میں نے بہت کر کے غور
نہیں شکل اِس کے سوا کوئی اور
کریں چل کے ہم بمبئی میں قیام
ٹھہرنے کا ہوجائے جب انتظام
تو پہلے اکیلا وہاں جاؤں میں
حقیقت جو کچھ ہے وہ سمجھاؤں میں
تردُد میں اُن کو اگر پاؤنگا
تو پھر باغباں کو بلا لاؤنگا
یقیں ہے وہ بیٹی کو پہچان لے
نظر ملتے ھی حال سب جان لے
ھوا اِس طرح طے جو یہ مرحلہ
تو پھر اُن کو دونگا تمہارا پتہ
وہ اِس گفتگو سے ھوئی شادماں
کہ ھر لفظ سے تھی محبت عیاں

آمید اپنا جلوہ دکھانے لگی
تمنائے دل مُسکرانے لگی
حیا سے یہ پھر سر جُھکا کر کہا
کہ میں کیا ہوں اور عقل ہے میری کیا
کنیز ایک اپنی سمجھ لیجئے
مناسب جو ہو بات وہ کیجئے
کہا کامراں نے سُنو تو ذرا
بیاں تم نے قصّہ تو سارا کیا
نہ اب تک بتایا مگر تم نے نام
نہ کچھ اپنے والد کا نام و مقام
وہ کہنے لگی یوں بصد رنج و یاس
مرے دل میں تھا گھر کی عزّت کا پاس
مگر آپ کے حکم کا ہے خیال
اُنہیں لوگ کہتے ہیں مرزا کمال
مُقدّر کی گردش سے تھے بے خبر
مرا نام رکھا تھا رشکِ قمر
گئی اس کے کانوں میں جب یہ صدا
وہ گھبرا کے کہنے لگا کیا کہا

کہیں یہ وہی تو نہیں با کمال
وہ دهلی کے شہزادے مرزا کمال
مرے مُحترم اور مُکرّم هیں وہ
میں خادم هوں اُنکا مرے عم هیں وہ
سرافراز هے میرے والد کا نام
بہت دن سے ساگرهی میں هے قیام
لُٹا غدر میں عِشرتوں کا چمن
همارا بهی دهلی هے اصلی وطن
سیاحت کا جب سے ارادہ کیا
اُسی وقت سے عزمِ بالجزم تها
زیارت سے حاصل کرونگا سُرور
چچا کے قدم دیکھنے هیں ضرور
کہا تها یہ والد نے بهی بار بار
نہ بهولوں میں اِس فرض کو زینهار
ملوں اُن سے عرضِ ارادت کروں
میں کچھ روز کسبِ سعادت کروں
مگر جب هوا سوئے دهلی سفر
تو بد قسمتی سے ملی یہ خبر

کئی دن سے حضرت مع خاندان
کہیں شہر سے دور ہیں میہمان
ادھر کام زائد تھے اور وقت کم
مُقدّر میں لکھے تھے یہ رنج و غم
میں دھلی سے نکلا یہ حسرت لئے
تمنائے دیدارِ حضرت لئے
اِسے بھی یہ سُن سُن کے حیرت ہوئی
خوشی سے عجب دل کی حالت ہوئی
نہ تھی اِس حقیقت سے وہ بے خبر
کہ رشتہ نہیں کوئی باہم دگر
مگر تھا قرابت سے برتر سُلوک
عزیز و اقارب سے بڑھکر سُلوک
محبت کی دنیا میں تھا اک مثال
خلوص سرافراز و مرزا کمال
غرض کم ہوا جب تحیّر کا جوش
جب آیا ذرا اپنی حالت کا ھوش
تو یوں اُس نے پھر کامراں سے کہا
مرے حال پر مہرباں تھا خدا

کسی طرح اب میں پشیماں نہیں
کسی غیر کا مجھ پہ احساں نہیں
سُنیں گے جو آبا یہ سب ماجرا
کرینگے تہِ دل سے شُکرِ خدا

آٹھ اے ساقیٔ ماہوش خوش ادا
پھر اک جامِ رنگیں مجھے کر عطا
وہ مئے دے بڑھے جس سے رنگِ طرب
کہ آخر ہوا دورِ عہدِ تعب
وہ مئے دے کہ ہو جائے دل باغ باغ
مٹا دے حوادث کا ایک ایک داغ
وہ مئے کیف میں جسکے کھو جاؤں میں
اُمیدوں کے دامن میں سو جاؤں میں
وہ مئے دے جو کردے مجھے شادماں
بہ اندازۂ قسمتِ کامراں
وہ مئے دے جو دوڑائے رگ رگ میں خوں
نہ یہ غم رہے اور نہ سوزِ دروں

بختی اور راحت نصیبی

کہ اب کر چکے ختم رنجِ سفر
ہم کامراں اور رشکِ قمر
مُقدّر نے کی اِس طرح یاوری
ہوے خیر سے واردِ بمبئی
حریفوں سے دامن بچاتے ہوئے
چلے آئے چُھپتے چُھپاتے ہوئے
ہوئے اك سرا میں اقامت گزیں
یہ تدبیر پہلے سے تھی دل نشیں
مگر اب یہ مشکل ہوئی سَدِّ راہ
مصیبت نے کردی تھی حالت تباہ
یہ دونوں سراپا تھے تصویرِ یاس
نگاہیں تھیں مغموم شکلیں اداس
سیاہی تھی چہروں پہ چھائی ہوئی
خزاں جیسے گُلشن میں آئی ہوئی
اِسی فکر میں غرق تھا کامراں
مصیبت کرے اپنی کِس سے بیاں
یقیں کس کو ہوگا بایں حالِ زار
کہ میرا بھی ساگر میں ہے کاروبار

انگوٹھی کا تھا اور مُشکل سوال
کوئی اسکو سمجھے نہ چوری کا مال
یکایک ہوا اِسپہ یہ آشکار
کہ اک نوجوان تاجرِ ذی وقار
یہیں بمبئی میں ہے جس کا قیام
وہ ہے ان دنوں مرجع خاص و عام
سرا میں بھی آتا ہے وہ گاہ گاہ
کہ ہے اہلِ حاجت کی جُویا نِگاہ
یہ سُنکر ہوا کامران کو خیال
کسی طرح اس سے کرے عرضِ حال
اگر یہ جوان ہمنوا ہوگیا
تو سمجھو کہ عقدہ یہ وا ہوگیا
اِسی فکر میں تھا کہ اس سے ملے
عجب کیا جو یوں غنچۂ دِل کھلے
کہ آ ہی گیا ایک دِن وہ جوان
کھنچا اسکی جانب دلِ کامران
نہایت ہی دلکش تھے اسکے اصول
کہ اک اک ادا میں تھا حُسنِ قبول

کبھی خود بخود مُسکراتا ہوا
کبھی زیرلب گُنگناتا ہوا
نگاہوں میں لُطف و کرم ضَوفشاں
جبیں سے شرافت کا جوہر عیاں
دل آویز تھا اُس کا طرزِ خطاب
وہ ہر اَک کو دیتا تھا ہنسکر جواب
جو پایا اُسے اسقدر خوش مقال
یقیں بن گیا کامراں کا خیال
گیا بڑہ کے اُس نوجواں کو سلام
بصد آرزو اور بہ شوقِ تمام
پھر اِسطرح اُس سے مُخاطب ہوا
کہ اے صاحبِ لُطف وجُود وعطا
مرا حال چہرہ سے ہے آشکار
سمجھئیے مجھے بھی اک اُمیدوار
مری زندگی غم سے پامال ہے
سماعت کے قابل مرا حال ہے
ذرا اتنی تکلیف فرمائیں آپ
اِدھر ایک گوشہ میں آجائیں آپ

کہ میں حال اپنا بیاں کرسکوں
جو مقصد ہے میرا عیاں کرسکوں
یہ سُنتے ہی وہ کچھ پریشاں ہوا
مگر خوش کلامی پہ حیراں ہوا
نظر آرہا تھا اُسے اک جواں
دریدہ لباس و شگُفتہ بیاں
کھڑا ہے نِگاہیں جُھکائے ہوئے
بظاہر مصیبت اُٹھائے ہوئے
تبّسم کبھی اور کبھی لب پہ آہ
تقاضائے لُطف وکرم ہر نِگاہ
یہ دیکھا تو وہ مُدّعا پا گیا
ہٹا راہ سے اِک طرف آگیا
یہ کہنے لگا اُس سے پھر کامراں
عجب داستاں ہے مری داستاں
مجھے دیکھکر آپ حیراں نہ ہوں
مری گفتگو سے پریشاں نہ ہوں
میں اِسوقت ہوں بے دیار وغریب
موافق نہیں کچھ دِنوں سے نصیب

ہمیشہ مخالف نہ تھا روزگار
کبھی میرا بھی تھا بڑا کاروبار
مسلمان ہوں میرا یوسف ہے نام
وطن ہے جبلپور مشہورِ عام
تجارت کی خاطر کیا تھا سفر
بہت ہی مسرت فزا تھا سفر
پھرا چار جانب سیاحت بھی کی
سیاحت بھی کی کچھ تجارت بھی کی
ابھی تھا سفر ہی میں مصروف سیر
کہ باندھا مسافر سے گردوں نے بَیر
چلا آرہا تھا وطن کی طرف
رواں دشت سے تھا چمن کی طرف
یکایک ہوا کا جو رُخ پھر گیا
مصیبت کے گرداب میں گھِر گیا
ہوا دفعتاً نذرِ طوفان جہاز
نہ ہمدم کوئی تھا نہ تھا چارہ ساز
جو ہمراہ تھے ہوگئے غرقِ آب
ان آنکھوں نے دیکھا ہے کیا انقلاب

میں اور میری ہمشیر دو رہ گئے
ہمیں بچ گئے اور سب بہہ گئے
ستم تُند موجوں کے سہتے ہوئے
چلے ایک تختے پہ بہتے ہوئے
ابھی تھا جو کچھ روز عہدِ حیات
تو بہتے رہے ایک دن ایک رات
اسی کے کرم نے سہارا دیا
کنارے پہ تختے نے پُہنچا دیا
کہاں تک کہوں داستانِ الم
اٹھائے نہ آسدن سے کیا کیا ستم
کنارے سے پیدل روانہ ہوئے
کسی طرح ہم گرتے پڑتے چلے
مِلا دشت میں جو بھی کچھ کھا لیا
درختوں پہ شب کو بسیرا کیا
بھٹکتے پھرے ہم اِدھر اور اُدھر
نہ ہمراہ کوئی نہ تھا راہبر
بہت دن پریشان رہے راہ میں
ہزاروں ہی صدمے سہے راہ میں

غرض ٹھوکریں یوں ھی کھاتے ہوئے
مسلسل مُصیبت اُٹھاتے ھوئے
به مشکل یہاں آکے پہنچے ھیں ھم
یہ ھے مختصر اپنی رُودادِ غم
بس اب آپ سے ھے یہ اك التجا
خدا آپ کو دے گا اِس کی جزا
نہیں دولت و مال اب میرے پاس
اگر ھے تو ھے ایك ٹوٹی سی آس
رھی ھے یہ لے دیکیے انگُشتری
اگر مول لے لے کوئی جوھری
بڑی فکر سے مجھکو ھوگی نجات
مجھے جیسے مل جائیگی کائنات
اگر آپ اتنی عنایت کریں
غریبوں کو مرھونِ منت کریں
تو یہ سخت منزل بھی آسان ھو
مسافر کی راحت کا سامان ھو
سفر کے مصائب سے ھوں مُضمَحِل
ٹھکانے ھے عقل اور نہ قابو میں دل

سُنا جب یہ رنج و الم کا بیاں
ہوا خود بھی مغموم وہ نوجواں
بصد لُطف پھر اُس سے کہنے لگا
حقیقت میں ہے آپ کا غم بجا
مجھے آپ کی بات کا ہے یقیں
کہ ہر لفظ ہے آپ کا دل نشیں
یہاں کے لئے کچھ نہ گھبرائیں آپ
ضرورت ہو جو مجھ سے فرمائیں آپ
بہت دِن سے ہے اب وطن بمبئی
مجھے لوگ کہتے ہیں راحت علی
تجارت ہے میرا بھی پیشہ یہاں
خدا کی عنایت سے ہوں شادماں
اب اِس فکر میں کیوں پریشاں ہیں آپ
مسافر نہیں میرے مہماں ہیں آپ
مرا گھر ہے حاضر کرم کیجئے
مجھے میزبانی کا حق دیجئے
سُنا یہ تو یوں کامراں نے کہا
میں کیوں کر کروں شُکرِ احساں ادا

مسافر پہ ایسا کرم بے حساب
نہیں آپ کا اِس جہاں میں جواب
مگر حال میرا بہت ہے زُبوں
کہیں جا کے اِس شکل سے کیا رہوں
نہ تن پر لباس اور نہ حالت درست
قویٰ مضمحل دل کی رفتار سُست
ابھی تو مجھے رہنے دیجے یہیں
کہیں آنے جانے کے قابل نہیں
کرم کا تہہ دل سے ہے اعتراف
ابھی کیجئے مجھکو لیکن معاف
یوں ہی دیر تک دونوں شائستہ خو
محبت سے کرتے رہے گفتگو
اِدھر سے کچھ اِصرار ہوتا رہا
اُدھر سے کچھ انکار ہوتا رہا
دلائل جو دونوں کے تھے اُستوار
ہوا فیصلہ اِس پہ انجامِ کار
کہ راحت کا ہو میہماں کامراں
الگ آسکو لیکن مِلے اک مکاں

رہیں جس میں وہ اور رشکِ قمر
نہ ہو دُور جب تک ملالِ سفر
غرض لیکے وعدہ گیا وہ جواں
بہت بمبئی میں تھے اسکے مکاں
انہیں میں سے ایک اس نے خالی کیا
ضرورت کا سامان بہم کردیا
گیا لیکے پھر کامراں کو وہاں
کنارے پہ تھا شہر کے یہ مکاں
فضا تھی جہاں عیش و آرام کی
قرینے سے ہر چیز تھی کام کی
مکاں میں تھا اک مختصر سا چمن
سمندر بھی کچھ دور پر موجزن
یہ سامانِ راحت فزا دیکھکر
کچھ ایسا ہوا کامراں پر اثر
زباں رُک گئی ہونٹ تھرّا گئے
ستم کش کی آنکھوں میں اشک آ گئے
وہ منہ سے نہ اک حرف بھی کہہ سکا
نگاہوں نے اقرارِ احساں کیا

وہ تھی شُکرِ منّت کی ایسی نظر
جو بھاری تھی تقریر و تحریر پر
غرض پھر نہا دھو کے بدلا لباس
ہوئے دُور چہرہ سے آثارِ یاس
بہم دونوں رہنے لگے شادماں
مصائب کی آخر ہوئی داستاں
گزرتے تھے راحت میں شام و سحر
وہ آرام تھا جیسے اپنا ہو گھر
وہ کہتی تھی بھائی اسے یہ بہن
اِسی طرح ہوتے تھے وہ ہم سُخن
اِدھر ربط یوں میزباں سے بڑھا
تکلُّف رہا اور نہ پردا رہا
رہی جب نہ بیگانگی درمیاں
یہ راحت سے کہنے لگا کامراں
سُنا ہو گا تم نے بھی ساگر کا نام
گڑھی کے لئے ہے جو مشہورِ عام
وہاں ایک تاجر ہے عالی وقار
بڑے تاجروں میں ہے جسکا شُمار

بڑا کام بھی نام بھی ھے بڑا
سر افراز کہتی ھے خَلقِ خدا
خدا نے دیا تھا آسے اك پِسر
سکھائے تھے سب جسکو علِم و ھُنر
مُقدّر کا هیٹا تھا وہ نوجوان
ملا تھا آسے نام گو کامران
آسے بھی ھوا شوق سیر و سفر
گیا بہرِ نظّارۂ بحر و بر
سُنا ھے یہ میں نے سفر میں کہیں
سفینہ ھوا آسکا بھی تہ نشیں
وہ بیکس تو یوں نذرِ دریا ھوا
خدا جانے حالِ پدر کیا ھوا
فسانہ یہ راحت نے جس دم سُنا
تو بیساختہ آہ کی اور کہا
بھلا کوئی ایسا بھی ھوگا بشر
سُنی ھو نہ جس نے یہ غم کی خبر
عجب سانحہ یہ بھی ھے جانگداز
کہ ساحل کے نزدیك ٹوٹا جھاز

پدر کو یہ پہنچی ہے جب سے خبر
وہ دنیا و دیں سب سے ہے بے خبر
کیا بند یک لخت سب کاروبار
نہ شب کو سکوں ہے نہ دن کو قرار
نہیں ماں کے دل کو گھڑی بھر بھی چین
وہ رو رو کے دن رات کرتی ہے بین
یہ ہے اُن کا افسانۂ جاں گداز
اُنہیں صبر اِس غم میں دے کارساز
اِدھر کہہ رہا تھا وہ یہ داستاں
کہ بگڑی اُدھر حالتِ کامراں
تڑپ کر فُغاں اُس نے ناگاہ کی
جگر ہِل گئے اِس طرح آہ کی
یہ راحت نے دیکھا جو اِس پر اثر
تو گھبرا کے بولا کہ اے نوحہ گر
حقیقت میں یہ حادثہ ہے بڑا
سُنا جس نے بے چین وہ ہو گیا
مگر کوئی ہوتا ہے یوں بے قرار
ذرا اپنے دل پر نہیں اختیار

زمانے میں ہوتے ہیں ایسے ستم
کسی کے لئے کون کرتا ہے غم
یہ شائد ہے صدمے اٹھانے کا راز
کہ دل اسقدر ہو گیا ہے گُداز
یہ سُنکر کہا کامراں نے کہ ہاں
تمہیں کیا خبر کیا ہے رازِ نہاں
نہ کیوں ہو مرے دل کی حالت عجیب
مرے دوست میں ہوں وہی بدنصیب
وہی کشتۂ آفتِ ناگہاں
رہینِ جفائے فلک کامراں
چُھپایا تھا تم سے جو نام و نشاں
کچھ اسمیں مری مصلحت تھی نہاں
ٹھکانے نہ تھے کچھ تو ہوش وحواس
حیا کچھ تھی اور کچھ زمانہ کا پاس
سوا اس کے اک راز تھا اور بھی
جسے میں بتاؤں گا تم کو ابھی
بہت مجھ پہ تم نے کیا ہے کرم
نہ بھولوں گا جبتک کہ ہے دم میں دم

کہاں تم سے دنیا میں مخلص حبیب
سمجھتا ہوں اپنے کو میں خوش نصیب
یہ کہکر سُنایا تمام و کمال
ابھی تک چُھپایا تھا جو اُس نے حال
اِسی میں تھی رُودادِ رشکِ قمر
ستم ہائے گردونِ بیداد گر
یہ درد آفریں داستاں جب سُنی
تو راحت کو بھی سخت حیرت ہوئی
بہت دیر تک سر کو دُھنتا رہا
یہ کہتا رہا اور وہ سُنتا رہا
غرض کُھل گئے جب نشاں اور نام
جو باقی تھے قصّے ہوئے سب تمام
بہت دیر تک غور کرتے رہے
کبھی خوش کبھی آہ بھرتے رہے
یہ اِس گفتگو کا نتیجہ ہوا
کہ دونوں نے آپس میں طے کرلیا
کہ تارا کے ماں باپ کو لائیے
حقیقت اِنہیں پہلے سمجھائیے

وہ یہ سُن کے دھلی چلیں گے ضرور
وھاں پائینگے اپنے آنکھوں کا نور
ملی جیسے ھی ان کو تارا وھاں
وہ خود ھی ملائینگے پھر ھاں میں ھاں
مگر اب یہ در پیش آیا سوال
نہ جانے کہاں ھیں وہ آشفتہ حال
یہ تھی اِس دُھندلکے میں اک موجِ نور
کہ ھوگی قمر اُن سے واقف ضرور
اِسے ھوگا معلوم اُن کا مقام
وہ کس کے ھیں مہماں کہاں ھے قیام
غرض پھر قمر کو بلایا گیا
یہ قصّہ اُسے بھی سُنایا گیا
بتائے سب اُس نے وہ نام اور مقام
گزارے مہینوں جہاں صبح و شام
جسے سُن کے راحت یہ کہنے لگا
چلاؤں گا میں بمبئی میں پتا
ھوئی ھے یہیں عمر میری بسر
بہت میرے احباب ھیں با خبر

مگر جُستجو سے ہوا یہ عیاں
کہ غائب ہیں تارا کے باپ اور ماں
یکایک نہ جانے کدھر کھو گئے
کہاں اپنی وحشت میں گُم ہو گئے
یہ کہتا تھا راحت مجھے ہے یقیں
وہ دہلی گئے ہیں ملیں گے وہیں
کریں جُستجو جا کے اب ہم وہاں
وطن کے سوا جائیں گے وہ کہاں
ہوئی طے جو یہ منزل اوّلیں
تو آگے کوئی اور مُشکل نہیں
وہیں ہیں یہ دونوں پریشان حال
وہیں اپنے گھر ہونگے مرزا کمال
وہاں جمع جب ہو گئے سب کے سب
تو پھر کامیابی نہو کیا سبب
سُنائے گی تارا بھی سب داستاں
قمر کی مصیبت بھی ہو گی عیاں
تڑپتے ہوئے دل سُکون پائینگے
گھڑی بھر میں سب راز کُھل جائینگے

یہ ہے دوسری صورت دل نشیں
کہ تم اور کچھ روز ٹھہرو یہیں
مناسب یہی ہے وہاں جاؤں میں
ملوں اُن سے اور اُن کو سمجھاؤں میں
اُنہیں کر کے ہموار آگے بڑھوں
اکیلا ہی یہ مرحلہ طے کروں
نہیں مجھ سے آگاہ مرزا کمال
مگر کوئی صورت میں لونگا نکال
یہ مُشکل بھی آسان ہو جائیگی
کوئی بات آخر نکل آئیگی
اُنہیں اور مالی کو یاں بھیجکر
میں ساگر چلا جاؤں دینے خبر
یہاں جب پہنچ جائیں مرزا کمال
تم اُن سے ملو اور کرو عرضِ حال
قمر کی سُناؤ اُنہیں داستاں
کہ ہو جائے دُور اُن کا وہم وگماں
یہ تجویز سُنتا رہا کامراں
مگر فکر تھی اُس کے رُخ سے عیاں

زمیں پر نگاہیں جمائے ہوئے
وہ سوچا کیا سر جھکائے ہوئے
زباں سے نہ وہ کہہ سکا صاف صاف
عیاں چشم و ابرو سے تھا اختلاف
بڑی دیر تک بحث ہوتی رہی
بالآخر یہ جب شکل طے ہوگئی
تو راحت نے ساماں سفر کا کیا
اکیلا ہی وہ سوئے دہلی چلا
کبھی خوش تھا لیکن کبھی تھا اداس
کبھی دل میں امید تھی گاہ یاس
کبھی وہم سا کچھ گزرتا ہوا
یقیں کا کبھی نقش ابھرتا ہوا
بہر حال منزل کو پا ہی گیا
وہ دہلی کے نزدیک آ ہی گیا
نظر آیا دہلی کا جوں ہی سواد
مسرت سے دل ہوگیا شاد شاد
پڑی تھی جو غم کی گرہ کھل گئی
سفر کی کدورت بھی سب دھل گئی

نہ رکھتا تھا مالی جو نام و نمود
برابر تھا اس کا عدم اور وجود
مگر شوق کی رہبری کے نثار
نشاں مل گیا اس کا انجامِ کار
الگ شہر سے تھا اک اجڑا سا باغ
وہیں اسکے مسکن کا پایا سراغ
نہ کیفِ بہاراں نہ رنگِ چمن
نہ سر سبز پودے نہ سرو وسمن
نہ سوسن کے تختے نہ رنگیں گلاب
نہ جوہی نہ بیلے کی فصلِ شباب
ہر اک سو روش پر تھا انبارِ خس
برستی تھیں ویرانیاں ہر نفس
نمایاں تھے ویرانہ پن کے نشاں
کہیں تھے ببول اور کہیں بیریاں
غرض باغ کا کوئی پرساں نہ تھا
کوئی دلفریبی کا ساماں نہ تھا
بنی وسط میں تھی جو بارہ دری
وہ سب جھاڑ جھنکاڑ سے تھی بھری

ابابیلوں کے غول چھائے ہوئے
کبوتر نشیمن بنائے ہوئے
یونہیں دیکھتا بھالتا وہ جواں
گیا ایک جانب تجسّس کُناں
نظر آئی ٹوٹی سی ایک جھونپڑی
کنارے پہ تھی باغ کے جو پڑی
گھنی تُھونیاں جھونک کھائی ہوئی
زمانے کے ہاتھوں جُھکائی ہوئی
قریب آسکے بُڑھیا اک آئی نظر
اٹھائے قدم آرہی تھی اِدھر
جبین پر شِکن تھی نگاہیں اداس
دُھواں چشم و ابرو میں چہرے پہ یاس
کئے ٹوک کر اسکو جب کچھ سوال
عیاں ہوگئی صاف وجہِ ملال
کہ بدبخت مالی کا مسکن ہے یہ
ضعیفہ ستم دیدہ مالن ہے یہ
وہ جس گُل کی خوشبو سے تھی شاد شاد
اڑا کر اسے لے گئے نامراد

وہ دولت جو رکھتی تھی دل کو قوی
وھی بدنصیبی سے چوری گئی
کوئی زیست کا اب سہارا نہیں
کہ گھر میں وہ آنکھوں کا تارا نہیں
بیان آسکا تھا اِسقدر دل خَراش
کہ سُن کر کلیجہ ھوا پاش پاش
ابھی ھو رھی تھی یہی داستان
کہ مالی بھی اِتنے میں آیا وھاں
اِسی غم کا مارا تھا وہ بھی غریب
بلاکش مصیبت زدہ بدنصیب
خمیدہ کمر زرد رُو دل فِگار
نگاھوں سے ظاھر کہ ھے بیقرار
مسرّت کی پونجی گنوائے ھوئے
دَھڑکتا کلیجہ دبائے ھوئے
بہت دیر تک غور کرنے کے بعد
بڑے درد سے آہ بھرنے کے بعد
کہا کون ھو بھائی آئے ھو کیوں
پریشاں ھو کیوں سَر جُھکائے ھو کیوں

کہو ہم غریبوں سے کیا کام ہے
کہاں ہے وطن اور کیا نام ہے
یہاں خار ہی خار ہیں گُل کہاں
یہاں بُوم بستے ہیں بُلبُل کہاں
یہاں آسماں ظُلم ڈھاتا ہے روز
رُلا کر ہمیں مُسکراتا ہے روز
وہ جب اپنی رُودادِ غم کہہ چکا
تو راحت نے اسطرح اس سے کہا
وہ شب ہوچکی وہ فسانہ گیا
وہ گردش کے دن وہ زمانہ گیا
میں آیا ہوں لیکر خوشی کی نوید
کہ تارا کا تم کو بتانا ہے بھید
مقدّر نے آخر کیا تم کو شاد
مبارک ہو منہ مانگی پائی مُراد
یہ سُنکر خوش ایسے ہوئے رودئے
غریبوں نے عقل و خِرد کھودئے
پھرے گِرد راحت کے پروانہ وار
کبھی دم بخُود تھے کبھی بیقرار

کچھ ایسا رہا دیر تک اضطراب
حقیقت کو جیسے سمجھتے ہوں خواب
ابھی ,,جُھٹ پٹا،، تھا ہوئی تھی نہ شب
چلے جانب شہر وہ سب کے سب
کیا پہلے راحت نے یہ انتظام
کہ تجویز کی اُن کی جائے قیام
ذرا ایک دو روز بھر دم لیا
مگر فرض سے اپنے غافل نہ تھا
شناسائیاں بھی بڑھاتا رہا
ادھر اور اُدھر آتا جاتا رہا
وہ ایسا یہاں اجنبی بھی نہ تھا
تجارت کا تھا کچھ نہ کچھ سلسلہ
نہ تھا ربط دھلی کے بازار سے
مگر تھا وہ آگاہ تُجّار سے
اُنہیں میں تھے دو ایک وہ باخلوص
کہ جن سے ذرا ہو گیا تھا خُلوص
وہ سب نام سُن سُن کے آنے لگے
مُروّت کے جوہر دِکھانے لگے

طرب آفریں صُحبتیں بھی رھیں
ھوئی سیر بھی دعوتیں بھی رھیں
اُنہیں سے ھوا یہ بھی معلوم حال
نہایت پریشان ھیں مرزا کمال
اِسی فیصلہ پر ھے ابتک عمل
کہ لڑکی پہ آسیب کا ھے خلل
کِسی طرح آفت یہ ٹلتی نہیں
کہ صحت کی صورت نکلتی نہیں
یہ سُنتے ھی وہ مطمئن ھوگیا
اُمیدوں کی دُنیا میں دن ھوگیا
اب اُس نے گڑھی دل سے اک داستاں
وہ کرتا رھا اُس کو سب سے بیاں
کہ شائد یہاں کوئی عامل نہیں
جو آساں نہ ھو یہ وہ مُشکل نہیں
مگر بمبئی میں ھیں اک مردِ پیر
رَمل اور عَمل میں ھیں جو بے نظیر
مِٹاتے ھیں دم بھر میں جِن کا اثر
کچھ ایسی ھے اُن کی نظر با اثر

یہ مشہور قصّہ ہوا اِس قدر
انہیں بھی ملی رفتہ رفتہ خبر
ملے آکے راحت سے مرزا کمال
کہ اُن کو تو ہر دم یہی تھا خیال
یہ کوشش ہوئی اُس کی جب کامیاب
تکلّف کے بھی اُٹھ گئے سب حِجاب
تو راحت نے اک روز اُن سے کہا
کہ اس مسئلہ میں ہے اب دیر کیا
اب اِس میں تامُّل نہ فرمائیں آپ
مناسب ہے یہ بمبئی جائیں آپ
وہ حضرت کہیں آتے جاتے نہیں
میں ورنہ انہیں لیکے آتا یہیں
مرے جھونپڑے میں اگر ہو قیام
تو میری سعادت میں ہے کیا کلام
مرے بھائی اور دوسرے اہلکار
رہیں گے مری طرح خِدمت گُزار
شناسا ہیں وہ بھی ہر اک راہ سے
ملا دینگے درویشِ آگاہ سے

مرزا کمال سے راحت کی ملاقات

میں ہمراہ چلتا مگر کیا کروں
کچھ ایسا ہے موقع کہ مجبور ہوں
مرے دل میں خود اک خَلش ہے نہاں
بہت جلد پہنچونگا میں بھی وہاں
غرض یہ ہوا گفتگو کا مآل
کہ راضی ہوئے اِس پہ مرزا کمال
کہا خیر وعدہ یہ فرمائیں آپ
جہاں تک بھی ہو جلد آجائیں آپ
روانہ ہوئے وہ سفر پر اُدھر
اِدھر بمبئی اُس نے بھیجی خبر
کہ تشریف لاتے ہیں مرزا کمال
رہے اُن کی آسائشوں کا خیال
یہ اور ایک تدبیر کی اختیار
کہ تھی منحصر اُس پہ تکمیلِ کار
ہر اک بات مالی پہ کردی عیاں
بتادی جو کچھ مصلحت تھی نہاں
اُسے بھی روانہ کیا بمبئی
ملازم دیا اک پئے رہبری

یہ سب انتظام اُس نے جب کر دیا
تو دھلی سے خود سوئے ساگر چلا
پہنچکر وھاں اُس نے ''سُن گُن'' جو لی
عجب دُکھ بھری اک کہانی سُنی
بڑی درد مندی سے کہتے تھے لوگ
غضب ھے جوانمرگ بیٹے کا سوگ
کوئی باپ یا رب نہ یوں سر دُھنے
کوئی ماں نہ یوں غم میں تِنکے چُنے
ملے مرگِ فرزند کی جب خبر
تو کیوں شق نہ ھو جائیں قلب و جگر
غریبوں پہ دورِ جہاں تنگ ھے
کہ اب زندگی کا عجب رنگ ھے
پدر غم میں رھتا ھے اکثر خموش
مگر بین ماں کے اُڑاتے ھیں ھوش
غرض جب وہ پہنچا قریب مکاں
تو اک عالمِ یاس پایا وھاں
ملازم نگہبان سب افسُردہ دل
پریشان و رنجیدہ و مُضمحِل

بجا لائے وہ بیدلی سے سلام
کیا عرض فرمائیے کیا ہے کام
کہا اُس نے خالی حصولِ نیاز
سر افراز فرمائیں گر سرفراز
وہ کہنے لگے سَر جُھکائے ہوئے
کہ مالک ہیں غم کے ستائے ہوئے
کسی سے ہیں مِلنے کے قابل کہاں
بہت دن سے قابو میں ہے دل کہاں
ندامت ہمیں آپ سے ہے ضرور
سفر کر کے آپ آئے ہیں اتنی دُور
مگر کیا کریں کوئی چارہ نہیں
انہیں چھیڑنا بھی گوارا نہیں
سُنا یہ تو راحت نے اک آہ کی
بڑی قدر کی ہر بہی خواہ کی
کیا اُن پہ ظاہر یہ رازِ نہاں
بتایا کہ ڈوبے نہیں کامراں
سُنایا مُفصّل وہ قصّہ تمام
کہا پھر کہ اِس طرح کرنا یہ کام

یکا یک نہ دیجائے اُن کو خبر
کہ دل ڈوب جانے کا ھے اِس میں ڈر
سُناؤ اُنھیں اک خبر کی طرح
بنو چارہ گر چارہ گر کی طرح
یہ کہنا مُسافر سا اک آدمی
وطن غالباً جس کا ھے بمبئی
ملاقات ھے اُس کو مدِّ نظر
وہ کچھ لیکے آیا ھے اچھی خبر
خوشی سے وہ سب اِس پہ راضی ہوئے
کہ تازہ سب احساسِ ماضی ہوئے
یہ فقرہ ھوا اِس قدر کامیاب
کہ مٹنے لگا خود بخود اِضطراب
سرافراز کو ھوش آنے لگا
وہ کچھ سوچ کر مُسکرانے لگا
چَھٹا دل کے آئینے سے غم کا زنگ
دکھانے لگے فہم و اِدراک رنگ
نِگاھوں میں پھرنے لگا کامراں
تصوُّر میں دیکھا تبسُّم کُناں

چھلکنے لگا ساغرِ آرزو
مچلنے لگی لذّتِ جستجو
کہا وہ مسافر ہے آخر کہاں
اسے کوئی لے آئے جاکر یہاں
یہ سُنکر بڑھا راحتِ خوش کلام
ادب سے کیا پہلے جُھک کر سلام
یہ کی عرض پھر میں ہوں وہ اجنبی
سُنائی تھی جس نے نویدِ خوشی
خدا کی عنایت پہ رکھئے نگاہ
بڑی بندہ پرور ہے ذاتِ اِلٰہ
اگر فضل کرنے پہ آتا ہے وہ
تو ہر رنج دل سے مٹاتا ہے وہ
یہ سُنکر بڑھا دل کا سوز و گُداز
مخاطب ہوئے اس سے یوں سرفراز
اب آنکھیں نہیں چشمۂ زہر ہیں
یہ آوارۂ گردشِ دہر ہیں
بھنور میں ہے اب میری کشتی رواں
تلاطم میں آرامِ ساحل کہاں

یہ سینہ نہیں مخزنِ درد ہے
تڑپتی تھی جو نبضِ دل سرد ہے
یہ سب سُن کے راحت نے اُن سے کہا
کہ ہونا تھا جو خیر وہ ہو چکا
خدا نے کیا آپ پر یہ کرم
اُسے بھا گئی آپ کی چشمِ نم
سفینہ ہوا نذرِ طوفاں مگر
رہی کامراں پر خدا کی نظر
جو صدمے تھے قسمت میں سہتے رہے
تھپیڑوں میں طوفاں کے بہتے رہے
یونہیں ڈوبتے اور اُبھرتے ہوئے
تلاطم کی حد سے گذرتے ہوئے
کنارے پہ اِک روز آ ہی گئے
نجات اُس کشاکش سے پا ہی گئے
مگر دُشمن اب اُن کے بیمار ہیں
ابھی ناتوانی کے آثار ہیں
ادا پہلے شکرِ خدا کیجئے
دوا کیجئے پھر دعا کیجئے

یہاں اُن کا لانا تو مشکل نہیں
سفر کی صَعوبت کے قابل نہیں
اِسی ڈر سے اُن کو وھاں چھوڑ کر
یہاں خود میں آیا ھوں لیکر خبر
پسِ پردہ تھی مادرِ کامراں
سُنی اُس نے جس وقت یہ داستاں
نکل آئی پردہ سے باھر غریب
کہ تھی شادی و غم سے حالت عجیب
خوشی کے وہ آنسو بہانے لگی
وہ راحت کے قربان جانے لگی
سرافراز سے پھر یہ کہنے لگی
ضرورت نہیں اِس میں اب دِیر کی
مرے کامراں سے ملا دو مجھے
ابھی اُس کی صورت دکھا دو مجھے
سرافراز نے مُسکرا کر کہا
کرو شُکرِ نعمت کا سجدہ ادا
یہ مہمان ھیں اِن کی خاطر کرو
چلیں گے وھاں بھی ذرا دم تو لو

سفر پر ہوئے یہ روانہ اِدھر
کیا ختم مرزا نے اپنا سفر
ہوئے واردِ بمبئی جب کمال
نہاں دل میں تھے سَو طرح کے خیال
کبھی ناامیدی سے دلگیر تھے
کبھی وہ امیدوں کی تصویر تھے
وہ آویزشِ عقل واحساس تھی
کبھی آس تھی اور کبھی یاس تھی
مکمل جو پہلے سے تھا انتظام
مُہیا تھے سامانِ راحت تمام
کمربستہ موجود تھے سب یہاں
ملازم فرستادۂ کامراں
اُنہیں لے گئے سب بہ شوق تمام
ٹھہرنے کا تھا جس جگہ انتظام
سفر دُور کا تھا وہ تھے کچھ نڈھال
ہوئی رفتہ رفتہ طبیعت بحال
تو پھر اُن سے ملنے گیا کامراں
لئے دل میں سوز و سُکوں کا جہاں

بہت اُن کو حیرت ہوئی دیکھکر
وہ سمجھے کہ دیتی ہے دھوکا نظر
وہ خاموش تھے اور یہ تھا اضطراب
الٰہی یہ بیداریاں ہیں کہ خواب
یہ دیکھا تو یوں کامراں نے کہا
تعجّب ہے اِس واقعہ پر بجا
کوئی میرے بچنے کی صورت نہ تھی
یہ کہئے کہ کچھ زِندگی تھی ابھی
سفینہ کا عالَم وہ طوفاں کا زور
نہ تھا جُز خدا پاسباں کوئی اور
سُنائی انہیں پھر کہانی تمام
گُزارے تھے جس طور سے صُبح و شام
یہی ذِکر اذکار ہوتے رہے
گلے مِل کے آپس میں روتے رہے
پھر اندر گئے لیکے مرزا کمال
کہ پردے کا باهم نہ تھا کچھ سوال
سُنایا یہ بیگم کو بھی ماجرا
یہی حال کچھ دیر اُن کا رہا

کہا پھر یہ بیگم نے تم ہو یہاں
خبر اپنے گھر کی بھی ہے کچھ میاں
قیامت ہے برپا وہاں صُبح و شام
تمہارا زباں پر ہے دونوں کی نام؟
سرافراز بھائی کے گُم ہیں حواس
وہ ماں غم کی ماری ہے تصویرِ یاس
اُنہیں بھی خبر تم نے دی یا نہیں
کوئی اِس کی تدبیر کی یا نہیں
بتایا اُنہیں کامراں نے تمام
کیا تھا جو اِس باب میں اِنتظام
بہت خوش ہوئے سُنکے دونوں یہ بات
جب اِس فکر سے ہو گئی کچھ نجات
مُخاطب ہوئے اُس سے مرزا کمال
سُنایا قمر کی علالت کا حال
کہ مُدّت سے اس دُکھ میں ہے مُبتلا
چلو چل کے دیکھو بہن کو ذرا
مِلے جسقدر اہلِ علم و عمل
یہ کہتے ہیں آسیب کا ہے خلل

نہ جانے ہے کیا دُھن سمائی ہوئی
نگاہوں میں وحشت ہے چھائی ہوئی
کبھی بات کی بھی تو دیوانہ وار
زباں وہ جیسے بولتے ہیں گنوار
ہوئے سینکڑوں ہی عمل رات دن
کسی کے آتارے نہ آترا یہ جن
بہت ڈھونگ ابتک رچائے گئے
نجومی سیانے بُلائے گئے
مناسب جو تھی سب نے تدبیر کی
نہ عُلوی چلی اور نہ سِفلی چلی
مجھے اعتبار اس پہ اصلا نہیں
مگر ہے تُمہاری چچی کو یقیں
وھی بمبئی بھی مجھے لائی ہیں
یہاں بھی اس آمید پر آئی ہیں
مگر میں سمجھتا ہوں بیمار ہے
نہ جن ہے کوئی اور نہ آسرار ہے
کہا آس نے یہ حال سُنکر تمام
نہیں آپ کے غم میں کوئی کلام

مگر اس کا ممکن ہے ردِّ عمل
ذرا میں تو دیکھوں وہ کیا ہے خلل
یہیں آپ دم بھر ٹھہر جائیے
بہن ہیں کدھر مجھ سے فرمائیے
غرض جا کے تنہا ملا کامراں
مفصّل سنا کر اسے داستاں
قمر کے بیاں کر کے سب رنج و غم
کہا یوں بھی کرتا ہے کوئی ستم
وہ نادان تھی ہوگئی اس سے چوک
کیا تم نے بھی تارا اچھا سلوک
حقیقت کسی پر بھی ظاہر نہ کی
تمہیں کیا ہوا تھا کہ چپ سادھ لی
کچھ ایسی قمر نے مصیبت سہی
نہ جانے وہ کسطرح جیتی رہی
جو یہ راز رہتا نہ یوں برقرار
تو ہوتی وہ کیوں رنج و غم کا شکار
تمہارے بھی ماں باپ کھاتے نہ غم
غریبوں پہ گرتا نہ کوہِ الم

مگر خیر ھونا تھا جو ھوچکا
بتاؤ کہ اب تم نے سوچا ھے کیا
میں کرلونگا خود اور سب انتظام
تمہارا ھے تنہا بس اِتنا ھی کام
چچا کو بُلاتا ھوں میں اب یہاں
حقیقت کرو آن پہ تم سب عیاں
سُناؤ اُنہیں تم یہ سب داستاں
مگر ھو نہ مشکوک دیکھو بیاں
خَجِل سی ھوئی پہلے کچھ غم نصیب
یہ کہنے لگی پھر وہ آکر قریب
انوکھی تو بیشک ھے یہ داستاں
مگر آپ مجھ سے نہ ھوں بدگماں
میں اپنی خوشی سے تو آئی نہ تھی
یہ میں نے تو صورت بنائی نہ تھی
جو تھا کھیل وہ بن گیا انقلاب
نگاھوں پہ ایسے پڑے کچھ حِجاب
اچانک ھوئی جو ھوئی واردات
نہ آئی سمجھ میں مری کوئی بات

بدل ھی گئی کچھ طبیعت مری
نہ جانے ھوئی کیوں یہ حالت مری
میں کرتی اگر خود یہ راز آشکار
تو شائد نہ ھوتا انہیں اعتبار
اگر آپ بنتے ھیں ضامن حضور
کہ سمجھینگے مجھکو یہ سب بے قصور
تو راز آن پہ ظاھر مرا کیجئے
سمجھ سوچکر ابتدا کیجئے
کہا اس نے ھنسکر نہ ھرگز ڈرو
حقیقت ھے جو تم وہ ظاھر کرو
جو اندیشے تھے ھو گئے جب وہ دور
گیا کامراں پھر چچا کے حضور
سمجھکر سب آغاز و انجام کار
کیا ان پہ رازِ نہاں آشکار
قمر کا لڑکپن دکھایا کبھی
اسے سوء ظن سے بچایا کبھی
کبھی یہ کہا پھیر قسمت کا تھا
کبھی یہ کہ منشاء ھی قدرت کا تھا

بُرا وقت ٹالے سے ٹلتا نہیں
مُقدّر پہ کچھ زور چلتا نہیں
کسی کو نہ تھا اسکا وھم وگُماں
مگر بات پہُنچی کہاں سے کہاں
خدا جانے کیا راز تقدیر ھے
کہ تارا قمر ھی کی تصویر ھے
یہی تھا مُقدّر کا لکّھا ھوا
کہ حضرت کو بھی اسپہ دھوکا ھوا
حقیقت سے یہ ماجرا دُور تھا
مگر کچھ خدا ھی کو منظُور تھا
سُنا یہ تو اُن کو ھوا گو ملال
مگر کہہ سکے کچھ نہ مرزا کمال
سُنی پھر جو تارا سے کُل داستاں
بڑھیں اور بھی اُنکی حیرانیاں
مگر تاب اِس کی نہ ماں لاسکی
کہ عورت کی سیرت ھے کچھ اور ھی
کیا کامران سے یہ اُس نے سوال
کہ بیٹا کہو کچھ قمر کا بھی حال

مشرقی غیرت

نصیبوں جَلی کیا سِتم کر گئی
ابھی تک وہ زندہ ہے یا مر گئی
کہاں لے گیا اُس کو بختِ زُبوں
نہ اُس پر چلا موت کا بھی فسوں
ملی کون سی سر زمیں پر پناہ
نکالی کہاں سر چُھپانے کی راہ
نہ شَل ہو گئے پاؤں چلتے ہوئے
نہ شرم آئی گھر سے نِکلتے ہوئے
حیا بھی نہ سینہ کو برما گئی
نہ اُس کو کسی کی نظر کھا گئی
زمیں نے مِٹایا نہ اُس کا نشاں
نہ سر پر گِرا ٹوٹ کر آسماں
نہ بڑھ کر شرافت نے روکا اُسے
نہ کمبخت غیرت نے ٹوکا اُسے
ہوا خانداں کا نہ اُسکو خیال
نہ دُنیا کی رسوائیوں کا ملال
نہ لرزا کلیجہ نہ سہمی نگاہ
نہ انجام کا ڈر ہوا سنگِ راہ

نصیبوں میں بدنام ہونا بھی تھا
ہمیں جیتے جی آس کو رونا بھی تھا
اِدھر کامراں نے جو دیکھا یہ طَور
تو کچھ دیر دل میں کیا اُس نے غور
نئی گفتگو کی نکالی یہ راہ
کہا اِس میں کیا ھے قمر کا گُناہ
چچی آپ تو خود ھیں صاحب نظر
زمانے کی رفتار سے با خبر
کہاں لب کُشائی کی مجھکو مجال
کہ میں کیا ھوں اور کیا ھے میرا خیال
تقاضائے خُردی یہ ھے چُپ رھوں
اجازت اگر ھو تو میں کچھ کہوں
یہ دُنیا ھے اک محشرِ حادثات
ھماری تباھی تو ھے کل کی بات
ابھی تک ھیں آنکھوں سے آنسو رواں
کہ بھولی نہیں غدر کی داستاں
مُقدّر نے اِس طرح پھیری نظر
ھوئی کیسی دُنیا اِدھر سے اُدھر

وہ عظمت نشاں زندگی کیا ہوئی
جلالت وہ تیمور کی کیا ہوئی
نہ وہ گردشِ آسمانی رہی
نہ بابر نہ وہ تُرکمانی رہی
نہ وہ عزم وہمّت کا منظر رہا
نہ فرّ جہانگیر واکبر رہا
شہنشاہ قیدی بنائے گئے
اسیروں کی صف میں بٹھائے گئے
دِکھائیں یہ وسمت نے بربادیاں
نکالی گئیں گھر سے شہزادیاں
نہ چادر سلامت نہ رُخ پر نقاب
جو اپنے تھے اُن کو بھی تھا اجتناب
وہ شہزادیاں جن کا آنچل کبھی
نگاہ فلک دیکھ سکتی نہ تھی
ہوائیں کِدھر سے کدھر ہو گئیں
پلک مارتے در بدر ہو گئیں
جو طوفان کو فتح کرتے رہے
وہی تیغ کے گھاٹ اترتے رہے

لُٹا قصرِ دولت گیا تخت و تاج
امیری کے گھر تھا فقیری کا راج
سلامت نہ وہ تاجداری رہی
نہ وہ صولتِ شہر یاری رہی
کسی نے حریفوں کو ٹوکا نہیں
کسی نے یہ طوفان روکا نہیں
ہوئے جب شہنشاہِ دہلی اسیر
کہاں تھے رئیس اور کہاں تھے امیر
ڈھلا بخت و اقبال کا آفتاب
کسی کے نہ روکے رُکا انقلاب
کسی کو نہیں وقت پر اختیار
خزاں ہے یہاں جب مآلِ بہار
تو پھر ایک نادان لڑکی غریب
یکایک ہوا جس کا دُشمن نصیب
اسے آپ دیتی ہیں اِلزام کیا
اسی نا سمجھ کا ہے یہ کام کیا
وہ نِکلی نہیں خود نکالی گئی
بھنور میں مُصیبت کے ڈالی گئی

نہ فریاد پر اُس کی آیا ترس
نہ درباں نے بھی جس پہ کھایا ترس
نہ در پر کسی نے سُنی اُس کی بات
نہ پہونچا کوئی گھر سے بہرِ نجات
ہزاروں سِتم جس پہ ڈھائے گئے
قیامت کے طُوفاں اُٹھائے گئے
صَداقت کو جِس کی غلط جان کر
خیال اُس پر آسیب کا مان کر
درختوں سے راتوں کو باندھا گیا
کوئی ظُلم تھا جو نہ توڑا گیا
نہ دیتے سہارا جو تاب و تواں
پہنچتا نہ گر وقت پر میں وہاں
تو کیا جانے کیا دُکھ اُٹھاتی غریب
یہ حالت تھی جیسے اجل ہو قریب
اِن آنکھوں سے دیکھا ہے وہ میں نے حال
کہ جس کا تصوّر بھی اب ہے مُحال
وہ صورت پہ درد و الم کے نشاں
وہ اُسوقت کی بیکسی الاماں

بھیانک وہ صحرا ببولوں کی چھاؤں
کُھلے بال جکڑے ہوئے ھاتھ پاؤں
فلک پر وہ نظریں جمائے ہوئے
خدا کی طرف لَو لگائے ہوئے
وہ آنکھوں میں آنسو وہ لب پر دعا
کہ اے میرے معبود میرے خدا
ترا ھی فلک ھے تری ھی زمیں
کہیں ان میں میرا ٹھکانا نہیں
کرم ھے ترا دو جہاں کے لئے
نہیں ایک مجھ نیم جاں کے لئے
تری ذاتِ اقدس ھے بندہ نواز
فقط کیا ھے میرے لئے بے نیاز
وہ سجدوں پہ سجدے دعا پر دعا
یہ بیکار تھے کیا مرے کبریا
اطاعت تری جُرم تھی کردگار
غلط تھا مری بندگی کا شعار
نہ تھا ٹھیک ایمانِ بالغیب کیا
نہیں ھے تری ذات لاریب کیا

سرِدار ہوں اور سہارا نہیں
سمندر میں ہوں اور کنارا نہیں
تجھی کو سمجھتی رہی نا خدا
یہ گرداب ہے اور ترا آسرا
مرے دل کی حالت سے واقف ہے تو
مجھے یاد ہے حکم لا تقنطو
خبر لے کہ اب ٹوٹنے کو ہے آس
سنبھال اب مجھے میرے فطرت شناس
قیامت کا فریاد میں تھا اثر
آسے غش مجھے ہوش آیا اِدھر
رگِ دل مری ٹوٹ کر رہ گئی
عناں ضبط کی چھوٹ کر رہ گئی
کہا مجھ سے دل نے کہ بیدار ہو
یہی وقت ہے اب خبردار ہو
مدد کر اب اِس کی جو انسان ہے
یہی آدمیّت کی پہچان ہے
یہ اُسکے مصائب کی ہے داستاں
اور اب اُس پہ ماں باپ ہیں بدگماں

اب اِنصاف سے آپ کیجئے نظر
اِس انجام کی تھی اُسے کیا خبر
یہ سُنکر بہت روئے مرزا کمال
رہا کچھ نہ اُسکی طرف سے مَلال
نہ وہ غم رہا اور نہ غصّہ رہا
بس ارمان بیٹی سے مِلنے کا تھا
دِکھایا اِدھر ماں کی اُلفت نے جوش
اُٹھا دل سے فریاد کا اِک خروش
وہ اب مامتا سے تھی بے اختیار
ذراسی بھی تاخیر تھی ناگوار

ادِھر دل مین تارا کے تھا یہ حجاب
قمر کو میں کس مُنہ سے دونگی جواب
کرونگی میں کِسطرح آنکھ اُس سے چار
اُٹھے گا نہ مجھہ سے ندامت کا بار
جہاں میں ہوں یہ میری منزل نہ تھی
میں اِس سرفرازی کے قابل نہ تھی

میں مالن کی بیٹی ہوں وہ رشکِ گُل
کہے گی سمجھکر دیا تو نے جُل
میں کیوں بھید دل میں چُھپائے رہی
قسم کچھ نہ کہنے کی کھائے رہی
وہ کھاتی پھرے ٹھوکریں کُو بکُو
یہاں اِسطرح میں رہوں سرخُرو
گزارے وہ غُربت میں شام و سَحر
میں کرتی رہوں چین سے دن بسر
وہ عصمت کی دیوی شرافت کی جان
بڑی جسکی عِزّت بڑا خاندان
جو آغوشِ راحت میں پالی گئی
جو عِشرت کے سانچہ میں ڈھالی گئی
مصیبت کبھی جس نے جھیلی نہ تھی
جو یہ کھیل جھوٹوں بھی کھیلی نہ تھی
مِلے اسکو ویران جنگل میں گھر
کہاں یہ محل اور کہاں رہگذر
یہ کیسے ہیں قِسمت کے پینچ اور بل
اسے کیوں ملا میری کَرنی کا پھل

ارے موت اب آکے رکھ میری لاج
مرے دُکھ کا اب صِرف تو ہے علاج
کوئی میرے جینے کا حاصل نہیں
کہیں مُنہ دکھانے کے قابل نہیں
بُرا میں نے چاہا ہے مَظلُوم کا
گلا میں نے گھونٹا ہے مُعصوم کا
مگر میں نے قصداً کیا کچھ نہیں
وہ مُجرم ہوں جس کی خطا کچھ نہیں
جو میں بھاگ جانے کا کرتی خیال
تو بد نام ہوجاتے مرزا کمال
اُنہیں جُرم کا پھر بھی ہوگر یقیں
تو پاداش سے اسکی باہر نہیں

قمر تھی اِدھر صَرف اُمید و یاس
کبھی مُطمئن تھی کبھی بد حواس
یہ آتا تھا رہ رہ کے اسکو خیال
خدا جانے کیا ہوگا میرا مآل

دکھاتا ہے کیا کیا مُقدّر ابھی
بُرائی پہ ہے کینہ پرور ابھی
یہاں والدین آنے والے ہیں اب
سِتم ہے خوشی کی جگہ ہو تعب
اُنہیں شکل کیونکر دکھاؤں گی میں
نظر اُن سے کیسے ملاؤں گی میں
وہ پُوچھینگے گھر سے نکلنے کا حال
کرینگے ہزاروں طرح کے سوال
کھڑی تھی اِسی دُھن میں رشکِ قمر
اداسی تھی رُخ پر پریشاں نظر
اُٹھائی جو آنکھ اُس نے پھرنا گھاں
نظر آئے آتے ہوئے کامراں
نہ جانے حیا آکے کیا کہہ گئی
کھڑی تھی جہاں بس کھڑی رہ گئی
یہ عالم تھا ہو جیسے تصویرِ یاس
بہ مُشکل کئے جمع ہوش و حواس
کہ اِتنے میں آپہنچے مرزا کمال
لئے ساتھ بیگم کو غم سے نڈھال

نظر ملتے ہی ہوگئی بے قرار
بڑھی آنکی جانب وہ بے اختیار
دوپٹے کا آنچل بھگوتی ہوئی
گری اُن کے قدموں پہ روتی ہوئی
بڑھا پھر تو وہ آہ وزاری کا جوش
کسی کو نہ باقی رہا اپنا ہوش
بڑا ہی غم انگیز وہ تھا سماں
کہ آنسو تھے آہیں تھیں اور ہچکیاں
بڑی دیر تک محشرِ غم رہا
یہی دونوں جانب کا عالَم رہا
چَھٹا آخرِکار وہ ابرِ یاس
کہ رونے سے نکلی دلوں کی بھڑاس
بہ مُشکل زمیں سے اُٹھایا اُسے
کلیجے سے ماں نے لگایا اُسے
ہوا کم جو احساسِ غم کچھ ذرا
کیا یک زباں سب نے شُکرِ خدا
وہی پھر محبت کے جوہر کُھلے
کچھ آپس میں شکووں کے دفتر کُھلے

کہا ماں نے اس سے ذرا یہ بتا
تجھے یاد میری بھی آئی نہ کیا
بڑھاپے کا میرے نہ آیا خیال
نہ سوچی کہ کیا ہوگا امّی کا حال
نہ ابّا کو اپنے کیا تو نے یاد
یہ کیا ہوگیا تھا تجھے نامُراد
سُنا یہ تو یوں ہنس کے بولی قمر
کہیں آپ جو حق ہے وہ سر بسر
کسی نے مگر یہ نہ سوچا یہاں
مجھے کھا گئے کیا زمیں آسماں
ہوا آپکو بھی نہ تارا پہ شک
دکھائی نہ کچھ مامتا نے جھلک
نہ بدلے نظر آئے تیور نہ طَور
ادب قاعدے پر کیا کچھ نہ غور
نہ کچّی زباں پر بھی آیا خیال
نہ دل سے کیا آپ نے یہ سوال
کہ آسیب کا اِسپہ سایہ سہی
جنوں یہ نیا رنگ لایا سہی

مگر فرق کتنا ہے انداز میں
زباں میں تلفّظ میں آواز میں
سِڑی کا بھی لہجہ بدلتا نہیں
زباں کا طریقہ بدلتا نہیں
یہ تھا آپ کے دل پہ کیسا اثر
حقیقت کی جانب نہ پلٹی نظر
بلا کی طرح سر سے ٹالا مجھے
گئیں آپ گھر سے نکالا مجھے
میں اس روز مہمان جاتی اگر
تو دنیا میں ہوتی نہ یوں دربدر
خدا کی مُوئے پاسباں پر ہو مار
بنا تھا یہ موذی بڑا پہرہ دار
میں روتی رہی گڑگڑاتی رہی
اُسے واقعہ سب سُناتی رہی
نہ مانا مگر اس نے میرا کہا
مجھے کھینچ کر گھر سے باہر کیا
یونہیں داغ دل کے وہ دھوتے رہے
یہی ذکر آپس میں ہوتے رہے

اِدھر سوچتے تھے یہ مرزا کمال
کہ تارا تو ہے اب قمر کی مثال
سمجھتا رہا جسکو نورِ نظر
سکون جس سے پاتے تھے قلب و جگر
کلیجے سے جسکو لگاتا رہا
میں تسکینِ دل جس سے پاتا رہا
جو گھر میں مرے بن کے بیٹی رہی
قمر کی طرح باپ کہتی رہی
مجھے اب قمر کے برابر ہے وہ
سمجھئے کہ میری ہی دختر ہے وہ
بتایا وہ بیگم کو جو دل میں تھا
کہا پھر کہ تارا کا منشاء ہے کیا
خوشی سے رہے جیسے ابتک رہی
یہ اک اور بیٹی ہماری سہی
نہ تھا اِس سے تارا کو بھی اختلاف
کیا اُس نے اقرار خود صاف صاف
بہم مشورے پھر یہ ہونے لگے
کہ ماں باپ سے اُسکے کہہ دیجئے

که تار ارہے گی ہمارے ہی پاس
اسیطرح تم سے بھی ہے التماس
ہمارے ہی گھر کو گھر اپنا بناؤ
میسر ہے جو ہمکو وہ تم بھی کھاؤ
یہیں اِسکا اِکدن رچائینگے بیاہ
اِسی گھر میں اب اُس کا ہوگا نباہ
یہ تجویز تم کو جو منظور ہو
ہماری ہی دختر یہ مشہور ہو
یہی گفتگو ہورہی تھی ابھی
کسی نے یکا یک خبر آکے دی
کہ ساگر سے آئے ہیں راحت میاں
اجازت اگر ہو تو آئیں یہاں
یہ سُنتے ہی وہ اُٹھ کے باہر چلے
بہ عجلت پریشان و مضطر چلے
مگر حشر تھا جسکے دل میں نہاں
حقیقت میں وہ تھا فقط کامراں
خُصوصاً یہ جسوقت اُس نے سُنا
کہ تنہا ہیں راحت یہ قصّہ ہے کیا

یہ حالت ہوئی غم سے تھرّا گیا
دل آمڈا جبیں پر عرق آگیا
یہی تھا ہر اک کی زباں پر سوال
کہو خیر ہے کچھ سناؤ تو حال
یہ دیکھا تو وہ مسکرانے لگا
فسانے سفر کے سنانے لگا
مگر جب نظر آے مرزا کمال
ادب کا ہوا اسکو فوراً خیال
نگاہیں جھکا کر بصد احترام
کیا اس نے جھک کر پھر انکو سلام
ادب سے یہ پھر ان سے کہنے لگا
رہا شاملِ حال فضلِ خدا
مآل آرزووں کے دل خواہ ہیں
چچا اور چچی میرے همراہ ہیں
بہت ہیں مگر دونوں زار و نحیف
سفر دور کا پھر وہ اتنے ضعیف
یہ ڈر تھا کہ بگڑے نہ حالت کہیں
میں خود ہی یہاں ساتھ لا یا نہیں

انہیں چھوڑ آیا ہوں میں اپنے گھر
کہ ہو جائے کم کچھ تکانِ سفر
یہی گفتگو ہو رہی تھی یہاں
کہ اٹھی نظر جانبِ کامراں
نہ اب وہ سکوں تھا نہ وہ اسکے طَور
نظر آئی اسکی تو حالت ہی اور
پسینہ جبیں پر لبوں پر تھی آہ
نظر سے عیاں دل کا حالِ تباہ
یہ دیکھا تو گھبرا کے مرزا بڑھے
گلے سے لگا کر یہ کہنے لگے
بنایا ہے تم نے یہ کیا اپنا حال
خوشی میں بھی کرتا ہے کوئی ملال
وہ تھی شام کی دُھوپ جو ڈھل چکی
مصیبت کی اک اک گھڑی ٹل چکی
مبارک تُمھیں خدمت والدین
کَرو ان کے آغوشِ راحت میں چین
یہ حالت جو ان کو نظر آئیگی
قیامت ہی ان پر گذر جائیگی

جو قسمت میں لکھے تھے غم ہوچکے
خوشی اب مناؤ بہت رو چکے
یہ راحت نے بھی مسکرا کر کہا
اسی پر تمہیں دعوئ ضبط تھا
گزرتا ہے سب پر یہ عالم ضرور
کوئی اسطرح بھی نہ ہونا صبور
جنہیں زندگی ہورہی تھی وبال
تمہیں چاہئے اب تو اُن کا خیال
بتایا تھا میں نے یہ اُن کو وہاں
کہ بیمار ہیں آجکل کامراں
مری مصلحت اسمیں پنہاں یہ تھی
خوشی سے کہیں ڈوب جائے نہ جی
اُلٹ بھی تو جاتا ہے اسکا اثر
نہیں خوب اچانک خوشی کی خبر
سُنا جب محبت بھرا یہ بیاں
ہوئی مُطمئن خاطرِ کامراں
اِدھر تھی پریشان رشکِ قمر
کلیجہ پہ ہاتھ اور نظر سوئے در

کبھی تھی امید اور کبھی دل میں یاس
کھڑی ہو گئی آ کے پردہ کے پاس
مگر جب یہ مژدہ سُنایا گیا
کہ ساگر سے بھی قافلہ آ گیا
تو ہلکا ہوا دل سے بار گراں
ہوئے رُخ پہ آنسو خوشی کے رواں
وہ اشکوں سے دامن بھگونے لگی
مسرت کے موتی پرونے لگی
اسی حال میں آ گئے ناگہاں
سر افراز اور مادرِ کامراں
بڑھے دیکھکر اُن کو مرزا کمال
گیا عہدِ ماضی کی جانب خیال
ہوئے دونوں مُدّت کے بچھڑے بہم
دَھڑکتے تھے دل اور آنکھیں تھیں نم
اِدھر مادرِ کامرانِ حزیں
زنانے مکاں میں آتاری گئیں
کئے حسبِ دستور نیچی نظر
بجا لائی تسلیم رشکِ قمر

مگر اُن کے سینے میں تھا غم کا جوش
نہ اپنی خبر تھی نہ اوروں کا ھوش
برستی تھیں آنکھوں سے بے تابیاں
زباں پر تھا بس کامراں کامراں
غرض جب گیا دَورِ اُمید و بیم
پیامِ سکوں لیکے آئی نسیم
فسردہ دلوں کے کنول کھِل گئے
بھرے زخم بچھڑے ھوئے مل گئے
وھی چھڑ گیا شادمانی کا ساز
وھی کامراں تھا وھی سرفراز
وہ ماں زندگی جسکو بھاتی نہ تھی
مسرت سے پھولوں سماتی نہ تھی
کبھی ھنس کے کہتی کہو میرے لال
تمھیں یاد ھے کچھ وہ میرا خیال
میں کہتی نہ تھی گھر سے جاؤ نہ تم
میں ماں ھوں میرا دل دُکھاؤ نہ تم
مگر تم نے بدلا نہ اپنا خیال
جو ضد کی تھی دیکھا اب اسکا مآل

سرافراز سے تھا کبھی یہ بیاں
گئی آپ کی وہ نصیحت کہاں
سفر سے نہ روکو انہیں زینہار
کہ بنتا ہے یوں آدمی پُختہ کار
بہت خوش تھے بیٹا سفر پر گیا
ہوئے تجربے خوب جی بھر گیا
یہ قصّہ کبھی چھیڑتے تھے کمال
سرافراز کرتے کبھی کچھ سوال
اِسی میں جو راحت کا آیا خیال
کیا کامراں نے بیاں پھر یہ حال
زمانے میں ہیں ایسے انساں کہاں
جو ہوں راہ چلتوں پہ یوں مہرباں
نہ دیتی سہارا جو اِن کی نظر
مسافر نوازی نہ کرتے اگر
خدا جانے کیا ہوتا میرا مآل
بڑھاتا کہاں جا کے دستِ سوال
کئے ہیں اِنہوں نے کرم بے شُمار
میں اِن کے سبب سے ہوا کامگار

عطا کی ہے فطرت نے خوئے کرم

یہ اپنا سمجھتے ہیں غیروں کا غم

کہاں ایسے اربابِ صدق و صفا

ملے جن کی سیرت سے درسِ وفا

انہیں سے یہ سب شادمانی ملی

انہیں سے مجھے کامرانی ملی

مجھے حق نے دی ہے یہ عقل و تمیز

یہ بھائی سے بڑھکر ہیں مجھکو عزیز

سرافراز نے جب سُنا یہ بیاں

یہ اوصاف و اخلاق یہ خوبیاں

کہا تم سے اَسلاف کا نام ہے

یہی شانِ فرزندِ اسلام ہے

یہ عُمر اور یہ اخلاق حیراں ہوں میں

تہہ دل سے ممنونِ احساں ہوں میں

عیاں ہو سکے جذبۂ دل نشیں

مجھے ایسے الفاظ ملتے نہیں

اسی طرح پھر مادرِ کامراں

جو یہ غور سے سُن رہی تھی بیاں

دعائیں اسے دل سے دینے لگیں
یہ اظہارِ منت میں کہنے لگیں
خدا تم کو دے اِس کا اَجرِ جمیل
مرے کامراں کے ہوئے تم کفیل
مری بوڑھی آنکھوں کے تارے ہو تم
انہیں کی طرح مجھکو پیارے ہو تم
مبارک تھا یہ کامراں کا سفر
ملا مجھکو اک اور نورِ نظر
سُنی جب یہ باتیں محبت بھری
تو راحت نے پھر اٹھ کے تسلیم کی
جُھکا کر وہ سر اپنا کہنے لگا
کہ یہ عزت افزائیاں تا کجا
میسر ابھی کیا سعادت ہوئی
ادا کون سی ایسی خدمت ہوئی
زبان پر نہ ایسے سخن لائیے
مجھے یوں نہ محجوب فرمائیے
غرض جب ہوا ختم غم کا سماں
ہوئیں مُطمئن مادرِ کامراں

پڑی رُخ پہ تارا کے اُن کی نظر
بڑی اُن کو حیرت ہوئی دیکھکر
کیا اپنی بھاوج سے پھر یہ سوال
بتایا نہ کچھ آپ نے اس کا حال
کہ دختر فقط آپ کی ایک تھی
کہاں سے قمر دوسری آگئی
یہ ہے کون کسکی ہے نورِ نظر
کہ ہے ہو بہو جیسے رشکِ قمر
وہی رنگ روپ اور وہی چال ڈھال
وہی ناک نقشہ وہی ہے جمال
یہ سُنکر وہ پہلے تو ہنسنے لگیں
کہا پھر یہ افسانۂ دل نشیں
تمہیں جیسے راحت سا بیٹا ملا
مجھے کی خدا نے یہ بیٹی عطا
وہ دلبند ہے اور یہ نورِ نظر
یہ تارا ہے اور وہ ہے رشکِ قمر
غرض رفتہ رفتہ کیا سب بیان
بتایا اُنہیں اُس کا نام و نشان

کبھی جسکو سُنکر وہ خنداں ہوئیں
کبھی قُدرت حق پہ حیران ہوئیں
کوئی رازِ ہستی کو سمجھے گا کیا
کیا مِل کے دونوں نے شکرِ خدا
عجب اسکی قُدرت عجب شان ھے
بہرحال بندوں پہ احسان ھے
مُصیبت میں شکوہ نہ غم چاھئے
سدا اعترافِ کرم چاھئے



اِدھر اك نظر ساقیٔ دل نواز
کہاں تك چُھپے گا محبت کا راز
وہ بادل حِجابوں کے چھٹنے کو ھیں
تکلّف کے پردے اُلٹنے کو ھیں
بہت دن سے ہوں صرفِ سوز و گُداز
مرا نشہ بھی ہو حقیقت کا راز
وہ رعنائیاں ہوں وہ سرشاریاں
کہ لو دے اٹھیں دل کی چِنگاریاں

قمر کی طرح ضَو فشانی بڑھے
مری عشرتِ کامرانی بڑھے
حقیقت نہیں اب تصوّر کے خواب
بپا ہو زمانے میں اک انقلاب
زباں سے مری پھول جَھڑنے لگیں
نگاہیں زمانے کی پڑنے لگیں
وہ نشہ میں ہو میری طرزِ بیاں
کریں وجد سُن سُن کے اہلِ زباں
ہر اک سانس موجِ لَطافت بنے
ہر اک بات شرحِ حقیقت بنے
بدل دوں محبت کا طرزِ کُہن
پلٹ دوں جفاو وفا کا چلن
نئے محوروں پر ہوں اب جلوہ گر
محبت کی منزل کے شمس و قمر
مرے آنسوؤں کا ہو اب وہ مقام
ستارے کریں جن کو جُھک کر سلام
کچھ ایسی ہوں صَہبا کی رنگینیاں
مرے جام پر ہو شفق کا گُماں

نَسیمِ سَحر لڑکھڑاتی چلے
محبت کے ساغر پلاتی چلے
بدل دوں چمن کا نظامِ حیات
حریفِ سَحر ہو شگوفوں کی رات
نہ اب حُسن چھیڑے تغافُل کا ساز
نہ ہو عشق منّت پذیرِ نیاز
وہ اٹھیں گھٹائیں وہ آئی بہار
تری مَست نظروں کے ساقی نثار
بہت دن رہا بے نیازِ فُغاں
فریبِ سکوں میں دلِ کامراں
محبت کے شُعلے دباتا رہا
خَلش آرزو کی چُھپاتا رہا
رگوں میں ذرا کسمسایا جو خوں
تڑپنے لگی نبضِ شوق و جنوں
ہوا کم جو آلامِ ہستی کا جوش
تو آنے لگا سوزِ باطن کا ہوش
نگاہیں تھیں اب اور قمر کا جمال
اسی کا تصوّر اسی کا خیال

تمنا ٹھوکے سے دینے لگی
نظر جائزہ دل کا لینے لگی
کبھی بے یقینی کبھی اعتماد
کبھی دھوپ تھی اور کبھی ابر و باد
کبھی رقص کرتی تھی موجِ خیال
محبت کی نبضیں کبھی تھیں نڈھال
تبسّم لبوں پر کبھی آشکار
کبھی کیف تھا اور کبھی تھا خُمار
کبھی حُسن کی سادگی پر یقیں
کبھی عشق کی بیکسی پر حزیں
کبھی آسرا چارہ سازی کا تھا
کبھی ڈر اسے بے نیازی کا تھا
قمر بھی نہ تھی درد سے بے نیاز
چھڑا تھا اِدھر بھی غمِ دل کا ساز
نگاہیں تھیں ہر وقت یوں بیقرار
کسی کو ہو جیسے کوئی انتظار
نئی تھیں تصوّر کی نیرنگیاں
اِدھر کامراں تھا اُدھر کامراں

پریشاں پریشاں سی رھتی تھی وہ
کبھی آپ ھی آپ کہتی تھی وہ
طبیعت میں کیسی ھے یہ برھمی
کہ جیسے ھو کچھ زندگی میں کمی
مرے دل کو اللہ کیا ھو گیا
یہ کس درد میں مُبتلا ھو گیا
الٰہی یہ دل میں خَلِش سی ھے کیوں
رگ و پئے کے اندر تَپِش سی ھے کیوں
مصیبت کی باقی نہیں ابتو چھاؤں
ھوئے جاتے ھیں سرد کیوں ھاتھ پاؤں
کبھی پھر یہ آتا تھا اُسکو خیال
وہ کیا جانیں کیا ھے مرے دل کا حال
یہ غم اِس مصیبت سے کچھ کم ھے کیا
یہ دنیا ھے کیسی یہ عالم ھے کیا
چُھڑا کر وہ قیدِ گراں سے مجھے
کہاں لیکے آئے کہاں سے مجھے
زبان آشنائے تکلّم نہیں
لبوں کو مجالِ تبسّم نہیں

کہاں تک یونہیں دل کو بہلائیے
خود اپنے سے باتیں کئے جائیے
یہ رنگیں دھند لکا یہ نورِ سحر
یہ جلوے یہ رعنائی بارو بر
فضائے بیاباں مہکتی ہوئی
ہوائے گلستاں لہکتی ہوئی
یہ شبنم کے موتی دمکتے ہوئے
سرِ خاک ذرّے چمکتے ہوئے
فضا میں برستی ہوئی آب و تاب
ہوا میں مچلتی سی موجِ شراب
قیامت تھے فطرت کے یہ طور بھی
ستم آسپہ ڈھاتے تھے کچھ اور بھی
گزرتا تھا جب حد سے دردِ نہاں
غزل بن کے آتی تھی لب پر فغاں

(غزل)

لہو ہو کے آنکھوں سے بہہ جائے دل
کسی کا کسی پر اگر آئے دل

فضا حُسن کی مُسکراتی رهی
میں کہتا رها هائے دل هائے دل

کبھی آ کے اے کاش وہ دیکھتے
اُجڑتی هوئی میری دُنیائے دل

کہوں کچھ تو "شرمِ وفا" روکدے
جو خاموش بیٹھوں تو گھبرائے دل

کسی کے تصوّر میں کھو جائیے
اِسی طرح شائد بہل جائے دل

تغافل کے صدقے یہ پوچھے کوئی
کہاں تک مصیبت سہے جائے دل

محبت کا یہ کیف اُترے نہ هوش
الٰہی نہ اب هوش میں آئے دل

اُٹھا پھر نظر ساقیٔ عشوہ ساز
بتانا هیں اب مئے پرستی کے راز

وہ مئے دے بڑھے جس سے حُسنِ بہار
نِکھر جائیں کچھ اور بھی برگ و بار

وہ مئے جسکی تاثیر ہو لازوال
حیات آفرینی ہو جِس کا مآل
محبت کی آھوں سے کیھنچی ہوئی
مَچلتی نگاھوں سے کھینچی ہوئی
وہ مئے جس سے بنتی ہے زُلفِ خیال
بڑھا دے جو توقیرِ عشق و جَمال
وہ اَفشُردۂ آب و تابِ سحر
پڑے جس پہ خورشید و مہ کی نظر
وہ مئے جس میں ہو زندگی کا سُرور
جو ساغر میں ہو جیسے اك موجِ نور
وہ مئے جس میں ہو کامرانی کا لُطف
جوانی کی ضَو شادمانی کا لُطف
وہ مئے جس سے بِچھڑے ہوئے دل ملیں
نشاطِ جوانی کے غُنچے کِھلیں
بتائے جو اَسرارِ ذات و صفات
مِلے جس سے آسائشِ کائنات
چھڑیں اك نئی دُھن میں فطرت کے ساز
محبت محبت سے ہو سرفراز

بچھے پھر نئی اک بساطِ خیال
کُھلے ذہن انساں کا جس سے کمال
دلوں میں نئے ولولے ہوں جواں
محبت کا احساس ہو راز داں
وفا کو نگاہوں میں تولے ہوئے
بڑھے حُسن آغوش کھولے ہوئے
حوادث کا کھٹکا نہ باقی رہے
ابد تک یہی دَورِ ساقی رہے
غرض جب گیا عہدِ رنج و محن
ملا زندگی کو نیا پیرہن
بہ ظاہر نہ تھا کوئی رنج و ملال
مگر مُطمئن تھے نہ مرزا کمال
شب و روز دل میں اک اُلجھن سی تھی
سمجھ میں نہ آتی تھی صورت کوئی
نہ پایا کوئی اور جب راستا
یہ راحت سے آخر انہوں نے کہا
کہ آخر ہے اب زندگی کی بہار
ازل سے ہے یہ شیوۂ روزگار

حقیقت میں یہ زندگی کچھ نہیں
ابھی ہے ابھی آدمی کچھ نہیں
بکھرنے کو اجزائے ہستی ہیں اب
نہ غم ہی رہے گا نہ عہدِ طَرب
گُزرنا تھی جس طرح اچھی بُری
مری زندگی تو بسر ہو گئی
یہ کہکر وہ کچھ دیر تک چُپ رہے
کہ تھے دل میں جذبات اُمڈے ہوئے
دِکھانے لگا ذہن کا اِضطراب
وہ بھولے ہوے عہدِ رفتہ کے خواب
نگاہوں میں بادل سے گھرنے لگے
وہ ایّام آنکھوں میں پِھرنے لگے
جب اِس باغ میں تھا ہجومِ بہار
لطافت تھی سب میں وہ گُل ہوں کہ خار
کہا پھر تردّد کے انداز میں
میں کہتا ہوں جو کچھ رہے راز میں
یہی فکر اب مجھکو ہے ہر گھڑی
اِسی دُھن میں کٹتی ہے اب زندگی

یہ تم جانتے ہو کہ رشکِ قمر
فقط ایک ہے میری نورِ نظر
اِسی غم میں رہتا ہوں اکثر ملُول
کھِلیں جلد اب اِسکے سہرے کے پھول
زمانہ پہ ہے یہ حقیقت عیاں
بہت ہی خوش اَطوار ہے کامراں
شرف کون سا ہے جو اسمیں نہیں
نہ بر اس سے بہتر مِلے گا کہیں
سرافراز مُدّت کے ہیں غمگسار
مرا حال سب اُن پہ ہے آشکار
بتاتے ہیں تیور کچھ اُن کے مجھے
اِسی دُھن میں وہ بھی ہیں ڈوبے ہوئے
وہ ہر چند کچھ مُنہ سے کہتے نہیں
یہ قصّے مگر راز رہتے نہیں
مِٹا بھی چکی گرچہ دنیا ہمیں
نہ جانے سمجھتے ہیں وہ کیا ہمیں
وہ سازِ طرب وہ تَرانہ گیا
ہمارا وہ اگلا زمانہ گیا

ابھی دیکھتے ھیں وہ ماضی کے خواب
جو اس ذکر سے ھے اُنہیں اِجتناب
مگر جا کے اب تم یہ اُن سے کہو
مرے حال پر یہ عنایت کرو
کہ اِس میں خوشی سب کی مَستُور ھے
یہ رِشتہ ھمیں دل سے مَنظُور ھے
مگر اِن پہ ظاھر نہ ھو یہ کبھی
اشارہ تھا اس میں ھمارا کوئی
یہ سُنتے ھی راحت نے اُن سے کہا
کہ ھے آپکی رائے بالکل بجا
یہ ھے فرض میرا یہ میرا ھے کام
بہت جلد ھو جائے گا انتظام
سرافراز کو خود ھے یہ جُستجُو
وہ کرتے ھیں اکثر یہی گُفتگُو
بڑی فکر سے پائینگے وہ نجات
یہ تجویز تو اُن کے دل کی ھے بات
سرافراز کو جب مِلی یہ نوید
کہ فضلِ خدا سے بر آئی اُمید

کیا حال سب گھر میں جا کر بیاں
بہت خوش ہوئی مادرِ کامراں
خدا نے دِکھائی خوشی میں خوشی
کہ بیٹا بھی پایا بہو بھی مِلی
اِدھر شادماں تھے وہ عالی صفات
کمال اور اُنکی شریکِ حیات
اِدھر محوِ شکرِ خدائے جہاں
سرافراز اور مادرِ کامراں
مَسرت کی بستی سی بسنے لگی
گھٹا عِشرتوں کی برسنے لگی
قمر نے یہ جِسوقت مُژدہ سُنا
کیا دل ھی دل میں سپاسِ خدا
شرارت پہ تارا نے باندھی کمر
کہا باتوں باتوں میں یوں چھیڑکر
خدا نے تمہاری دعا کی قبول
کوئی دن میں کھلتے ھیں سہرے کے پھول
ھمیشہ رھے شادمانی تمہیں
مبارک ھو یہ ،، کامرانی ،، تمہیں

مِلی قید سے جنکے ھاتھوں نجات
وھی ھو رہے ھیں شریکِ حیات
قمر سُن کے یہ مُسکرانے لگی
نظر جیسے کچھ گُنگُنانے لگی
وہ چہرہ سے نورِ محبت عیاں
حیا کی وہ رُخسار میں سُرخیاں
کہا ھنس کے تارا سے اچھا شریر
کبھی میں بھی ایسے ھی مارونگی تیر
ٹھہر جا کبھی وہ بھی دن آئینگے
ترے ھونٹ بھی یون ھی سِل جائنیگے
خدا جانتا ھے وہ لوں انتقام
جو تڑپا نہ دوں تو سہی میرا نام
یہی ھر طرف تھی خوشی کی اُمنگ
یہی چھیڑ چھاڑ اور یہی رنگ ڈھنگ
ھنسی قہقہے تھے یہی صبح وشام
مئے زندگی اور مَسرّت کے جام
حقیقت بناتھا جو دل میں خیال
ھوا کامراں کی خوشی کا یہ حال

کہ اب زندگی کے سوا کچھ نہ تھا
نظر میں خوشی کے سوا کچھ نہ تھا
اِسی رَو میں اکدن جو دیکھا بہ غَور
تو بدلے نظر آئے راحت کے طَور
خلافِ امید و خلافِ قیاس
بہت اُس نے راحت کو پایا اُداس
نہ اَگلی سی شُوخی نہ پہلا سا جوش
کسی سوچ میں ہر گھڑی تھا خموش
کوئی پھول ہو جیسے بے رنگ و بو
فُسُردہ ہنسی مُضمحِل گُفتگُو
بڑی فکر میں پڑ گیا کامراں
کہ راحت تھا اب راحتِ قلب وجاں
دلِ کامراں میں یہی تھی خَلش
سمجھ میں نہ آتی تھی اُسکی رَوِش
رہا اُسکو آخر نہ یارائے صبر
چُھٹا ہاتھ سے جامِ صَہبائے صبر
وہ اک روز راحت سے کہنے لگا
تمہیں یک بیک ہو گیا ہے یہ کیا

تمہاری تو ایسی طبیعت نہ تھی
کبھی یوں خموشی کی عادت نہ تھی
کہو تو یہ آخر ہے کیا ماجرا
بتاؤ مجھے غم ہے کس بات کا
ہنسی رنج وغم کی اڑاتے تھے تم
کہ روتوں کو اکثر ہنساتے تھے تم
وہ اندازِ عشرت کہاں کھو گیا
نئے تم ہو یا میں نیا ہو گیا
تمہارے تو گھر بھر پہ احسان ہیں
تمہیں دیکھکر سب پریشان ہیں
قیامت ہے مجھ سے یہ پردہ یہ راز
مجھے تھا تمہاری محبت پہ ناز
تمہاری طبیعت اگر ہے علیل
تو کیا اسکی ممکن نہیں ہے سبیل
اگر بھا گئی ہے کوئی مہ جبیں
طبیعت اگر آ گئی ہے کہیں
تو مجھکو بتاؤ کچھ اس کا نشاں
کہ وہ دشمنِ جان و دل ہے کہاں

زمیں آسماں ایک کردوں گا میں
تمنّا کے دامن کو بھر دوں گا میں

یہ سُنتا رہا راحت خوش صفات
کچھ اسطرح جیسے نہ ھو کوئی بات

کہا پھر کہ میرا تو ھے یہ خیال
سمجھتے ھو میرا بھی اپنا سا حال

کہا تم سے کِس نے کہ بیمار ھوں
نہ غمگیں نہ میں صرف آزار ھوں

مرا دل نہیں وہ جو یہ غم سہے
محبت تُمہیں کو مبارک رہے

مگر کامراں تھا عقیل و فہیم
وہ ھر گُل کی پہچانتا تھا شمیم

فریبِ سُخن کھا نہ سکتا تھا وہ
بُھلاوے میں یوں آ نہ سکتا تھا وہ

کہا آپ کی بات کا ھے یقیں
مگر میں بھی نادان ایسا نہیں

کہیں مجھ پہ چلتا ھے ایسا فریب
کسی اور کو دیجئے گا فریب

تمہیں میرے سر کی قسم سچ بتاؤ
حقیقت نہ للہ مجھ سے چُھپاؤ
بڑھا حد سے اصرار جب اسقدر
نہ دیکھا جو راحت نے کوئی مفر
چُھپایا تھا ابتک بہت دل کا درد
لبوں پر اك آهی گئی آہ سرد
محبت کے طوفاں میں بہنے لگا
وہ رُك رُك کے اسطرح کہنے لگا
مجھے کوئی دُکھ ھے نہ کوئی ملال
کھٹکتا ھے دل میں مگر یہ خیال
کہ تارا کا ھوتا ھے انجام کیا
یہی فکر ھے صبح کیا شام کیا
یہ مانا وہ قسمت کی ھیٹی سہی
وہ ناشاد مالی کی بیٹی سہی
مگر اب کہیں غیر کیونکر اسے
چچا جب سمجھتے ھیں دختر اسے
وہ پہلا سا انداز سیرت نہیں
وہ اگلی سی اسکی طبیعت نہیں

یہاں بحث میں ہیں ابھی نسل و رنگ
ابھی ابنِ آدم پہ دُنیا ہے تنگ
کسے یاد ہے اب وہ درسِ حیات
وہی قومیت ہے وہی ذات پات
مسلماں کو ہے خود پرستی سے کام
اسی خود پرستی کا مذہب ہے نام
کئے جس نے اَسرارِ ہستی عیاں
وہ اِسلام اور وہ حقیقت کہاں
وہ میرِ عرب رازدانِ حیات
یہ سمجھا گیا ہے کہ یہ کائنات
یہ ہے اصل میں ایک ایسا شجر
محبت سے ہوتا ہے جو بارور
حقیقت کی یکساں ہے تابندگی
کوئی مشرقی ہو کہ ہو مغربی
یہاں ایک ہیں دادرس دادخواہ
برابر ہیں دونوں گدا ہو کہ شاہ
مگر اب یہ اسلام کا ہے مقام
کہ توحید ہے کچھ قیاسوں کا نام

نہ وہ ھم رہے اور نہ وہ سوز وساز
نہ آنکھوں میں آنسو نہ دل میں گُداز
یہی قابلِ فخر کیا طَور ہے
کہ دعوی تو اسلام کا اور ہے
غرض میرے دل پر اسی کا ہے بار
مجھے یہ رَوِش ہے بہت ناگوار
میں تارا کو جب دیکھتا ہوں اداس
ٹپکتی ہے جب اسکے بُشرے سے یاس
لگاتا ہے ایک چوٹ دل پر کوئی
چُبھوتا ہے سینہ میں نشتر کوئی
نہیں تم سے پنہاں طبیعت کا رنگ
سمجھتے ہو تم میری سیرت کا رنگ
مِلی ہے کچھ ایسی ہی فطرت مجھے
کہ ہے اسکے دُکھ سے محبت مجھے
قمر کا تو ہو ھی گیا انتظام
وہ فضلِ خدا سے ہوئی شاد کام
قرینہ یہ کہتا ہے تارا بھی اب
اِسی سوچ میں ہوگی صَرفِ تعب

یہی ہوں گے اسکے خیالات بھی
کہ انساں ہے مجبورِ جذبات بھی
محبت قمر کی طرح ہی سہی
وہ کہنے کو اِس گھر کی بیٹی سہی
بہر حال ہے دُخترِ باغباں
نسب ہے کچھ اسکا نہ ہے خانداں
کسی سے وہ کیونکر ملائے گی آنکھ
وہ اس حال میں کیا اُٹھائے گی آنکھ
نسب پر ہے دُنیا کو کیا کیا غرور
وہ چھیڑیگی دُکھتی ہوئی رگ ضرور
کہ مالن کی بیٹی کو اتنا دماغ
شریفوں میں بیٹھے یہ اسکا دماغ
یہ طعنوں کے ناوک نہ کھائیگی وہ
یقیں جاننا مرھی جائیگی وہ
بڑے جوش میں تھا وہ گرمِ سخن
وہ چہرہ پہ سُرخی جبیں پر شکن
اگر کامراں اور رہتا خموش
پہنچتا نہ جانے کہاں اس کا جوش

مگر بھید جب دل کا وہ پا گیا
سمجھ میں یہ سب ماجرا آ گیا
تو پھر اس نے یوں مُسکرا کر کہا
کہ ہوگی یہ تاویلِ غم تا کجا
مجھے بھی تہہ دل سے ہے اتفاق
یہ تفریقِ بیجا ہے مجھپر بھی شاق
یہ سب سطح بینوں کی ایجاد ہے
کہ اسلام اک دَرسِ آزاد ہے
یہاں تو بتایا گیا ہے یہی
بڑا تم میں وہ ہے جو ہے مُتّقی
غرض پھر یہ کہنے لگا کامراں
کہ یہ بات پہُنچی کہاں سے کہاں
میں سمجھا تمہاری یہ تارا غریب
قمر سے بھی کچھ بڑھ کے ہے خوش نصیب
چچا اور چچی جب یہ سُن پائینگے
یقیں ہے مجھے شاد ہو جائینگے
کہ تارا کا اِن کو بہت ہے خیال
گوارا نہیں اسکا رنج و ملال

سمجھتے ہیں نورِ نظر کی طرح
محبت ہے اُس سے قمر کی طرح
اِسی طرح باتیں وہ کرتا رہا
بڑی دیر تک یہ رہا سلسلہ
اُدھر ہو رہا تھا یہ تارا کا حال
ہنسی میں بھی تھا اُسکی رنگِ ملال
قمر کی جو تکمیل نسبت ہوئی
تو بیدار اُسکی بھی فطرت ہوئی
یہی سوچ اب اُسکو دن رات تھا
کہ میرے لئے جب یہ وقت آئے گا
یہ شادی کریگی کِسے شادماں
یہاں میرا سنجوگ ہوگا کہاں
کہاں یہ گھرانا شریف ونجیب
کہاں دخترِ باغباں بد نصیب
غنیمت تھا وہ اپنا اُجڑا سا باغ
کہ اس فکر سے تو وھاں تھا فراغ
اِنہیں چھوڑ دوں یہ بھی دُشوار ہے
کہ یہ شُکرِ احساں سے انکار ہے

کسی سے نہیں کوئی شکوا مجھے
سمجھتے ھیں یہ سب تو اپنا مجھے
ملا کرتے ھیں کس کو ایسے رفیق
جو ماں باپ سے بھی ھوں بڑھکر شفیق
مگر پھر بھی کیونکر بنے گی یہ بات
کہ میں تو بھر حال ھوں نیچ ذات
مجھ ایسی کو اپنا بنائے گا کون
بھلا ایسی ذلّت اُٹھائے گا کون
بتاتا ھے راحت کا طرز نظر
اُنہیں ھے کچھ احساس میرا مگر
خبر ھے کسے دل میں کیا ھے نہاں
محبت ھے یا ھیں فقط مہرباں
پھر ایسی کہاں کی ھوں میں خوبرو
کہ ھو اُن کے دل کو مری جستجو
محبت ھے اتنی بھی اندھی کہیں
مرا وھم ھے اور کچھ بھی نہیں
یہ تارا کا لیکن غلط تھا خیال
نہ تھا اسکی نظروں میں اپنا جمال

چھلکتی تھی آنکھوں میں موجِ شراب
قیامت سے ٹکرا رہا تھا شباب
وہ کیفِ نہاں کی ترنگوں کے دن
غضب ڈھانے والی اُمنگوں کے دن
اُبھرتا ہے ہر جذبۂ دل نشیں
جوانی کو جب ہوش رہتا نہیں
نشیمن کو برقِ نظر کی تلاش
خَلش کو کسی چارہ گر کی تلاش
کلیجے میں اک ہُوک اُٹھتی ہوئی
تڑپ دل میں اور سانس گُھٹتی ہوئی
کوئی دل پہ چرکے لگاتا ہوا
تصُّور بھی کچھ مُسکراتا ہوا
پریشاں تخیُّل پراگندہ ہوش
رگ و پئے میں ساری محبت کا جوش
یہی دُھن کہ مدہوش ہوجائیے
تمنا کی اُلجھن میں کھو جائیے
کوئی آ کے لے امتحانِ وفا
کوئی لُوٹ لے کاروانِ وفا

بلا سے نہ ہو چارہ فرما کوئی
تڑپنے کا دیکھے تماشا کوئی
نگاہوں سے پا جائے رُودادِ غم
تبسّم سے دے جائے جودادِ غم
جو ہنس ہنس کے تحفے نگاہوں کے لیے
مزے دھیمی دھیمی سی آہوں کے لیے
جو تھم تھم کے دل میں مچلتا رہے
جو پیہم کلیجہ مَسلتا رہے
کچھ اِس چال سے آئے مَستانہ وار
بڑھے ہر قدم پر غمِ انتظار
محبت سے طرزِ جفا سیکھ لے
رہ امتحانِ وفا سیکھ لے

مگر اِس سے آگاہ تارا نہ تھی
یہ صورت ابھی آشکارا نہ تھی
اِسے یہ بھی معلوم ابتک نہ تھا
محبت میں راحت کا عالم ہے کیا

تڑپتا ہے کس کس طرح وہ غریب
اٹھاتا ہے کیا سختیاں غم نصیب

اسی کا تصوّر ہے دن ہو کہ رات
یہی زندگی ہے یہی کائنات

حقیقت نہ تھی اس سے یہ بھی نہاں
محبت میں ہوتی ہیں بدنامیاں

اسی ڈر سے کچھ کہہ نہ سکتا تھا وہ
یہ رسوائیاں سہ نہ سکتا تھا وہ

یہ رہ رہ کے آتا تھا دل میں خیال
کہ بدظن نہ ہو جائیں مرزا کمال

ادھر یہ محبت میں تھی بیقرار
کوئی رازداں تھا نہ تھا غمگسار

بظاہر یہ دشوار تھا مرحلہ
مگر کامراں کیلئے کچھ نہ تھا

بہ طرزِ مناسب کہا اس نے حال
ہوئے سن کے مسرور مرزا کمال

یہ ڈر تھا کہیں ہو نہ وہ بدگماں
بلایا گیا اِس لئے باغباں

مخاطب ہوئے اُس سے مرزا کمال
کیا اُس سے اِسطرح اظہارِ حال
تمہیں تو ہے اِس بات کی خود خبر
کہ تارا بھی میرے لئے ہے قمر
بہر حال بیٹی تمہاری ہے وہ
مجھے بھی مگر دل سے پیاری ہے وہ
یہیں ہے جو مُدّت سے اُسکا قیام
تو اب اور ہے زندگی کا نظام
رہے گی یہاں خود یہ کہتی ہے وہ
ہماری طرح اب تو رہتی ہے وہ
مری بات کا گر نہ ہو اعتبار
وہ ہے عاقل و بالغ و ہوشیار
ذرا بھی نہ اِس میں تامّل کرو
بلاؤ اُسے اور یہ خود پوچھ لو
جو اِسلام سے اُسکو انکار ہو
ہمارے طریقہ سے کچھ عار ہو
تمہیں پھر ہے ہر طرح کا اختیار
کوئی دخل دونگا نہ میں زینہار

مجھے تم سے یہ اور کہنی ہے بات
کہ اب جھلملاتی ہے شمعِ حیات
ڈھلا دن ہوئی زندگانی کی شب
غنیمت ہے جو سانس باقی ہے اب
قمر کا تو میں کرچکا انتظام
کیا مجھکو اللہ نے شاد کام
مگر اب ہے تارا کا باقی سوال
یہی دل میں رہتا ہے ہر دم خیال
کہ ہوجائے اسکا ٹھکانہ کہیں
توقف اب اسمیں مناسب نہیں
یہ سُنکر عجب اسکی حالت ہوئی
یہ اخلاق دیکھے تو حیرت ہوئی
وہ کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا
زباں کو تکلّم کا یارا نہ تھا
خیالات کا تھا وہ سینے میں جوش
رہا تھا نہ باقی سروپا کا ہوش
بالآخر جو سنبھلی طبیعت ذرا
تو رُک رُک کے اِسطرح کہنے لگا

یہ کیا بات فرمار ھے ھیں حضور
کوئی مجھ سے شاید ھوا ھے قصور

یہ حال اب کہاں آشکارا نہیں
کہ ھے آپکی میری تارا نہیں

وہ ایسی عنایت کے قابل نہ تھی
وہ اِتنی محبت کے قابل نہ تھی

خطا اس "ادھرمی" کی ایسی نہ تھی
جسے جیتے جی بھول جاتا کوئی

کوئی اِس جگہ اور ھوتا اگر
نہ جانے وہ دیتا سزا کِسقدر

مگر آپ نے اُسکا بخشا قصور
یہ بس آپ ھی کا دھرم تھا حضور

کہاں ایسی "شکتی" ھے انسان میں
دَیا یہ تو ھوتی ھے "بھگوان" میں

جو حضرت کی مرضی ھو وہ کیجئے
کسی راہ چلتے کو دیدیجئے

ھوا کیا جو ھے آپکی راہ پر
کہ ھے دھرم میں اپنی اپنی نظر

سب انساں ھیں اور زندگی ایک ھے

دُھنیں مختلف راگنی ایک ھے

یہ اپنے بڑوں سے ھے میں نے سُنا

یہی دھرم بھی ھے مسلمان کا

کسی پر نہیں کوئی سختی بجا

کہ اسلام میں جبر ھے ناروا

بہت کرچکا ھے غلامِ اسپہ غور

ان آنکھوں نے دیکھا ھے شاھی کا دَور

سبق اس زمانہ کے بُھولا نہیں

میں اَن پڑھ ھوں نادان ایسا نہیں

یہاں کل تک آخر رھا کس کا راج

ابھی کس کے سر پر تھا بھارت کا تاج

یہی اُن کے انداز ھوتے اگر

مسلماں ھی دھرتی پہ آتے نظر

سُنا ھے یہ آنکھوں سے دیکھا نہیں

مگر جھوٹ اسمیں ذرا سا نہیں

مرے سامنے تھا کہاں وہ بناؤ

کہ شاھی کا تھا اس سمے چل چلاؤ

یہ سُنتے ہی سُنتے ہوا اتنا سن
بڑی ،، وشانتی ،، کے تھے وہ راتدن
کسی نے کسی کو نہ سمجھا تھا غیر
نہ ہندو مسلمان میں تھا کوئی بَیر
وہ رکھتے تھے آپس میں ایسا پریم
نہ بھائی کو بھائی سے ہوگا پریم
یہ ہندو دھرم راج نیتا بھی تھے
وہ راجہ بھی تھے اور پرجا بھی تھے
بڑا چین سُکھ تھا غریبوں کے بیچ
کہ اسوقت ایسی نہ تھی اونچ نیچ
یہ کانٹے دلوں میں کھٹکتے نہ تھے
کہیں ان میں دامن اٹکتے نہ تھے
وہ ایسی تھی آرام کی زندگی
کہ جسکے لئے اب تڑپتا ھے جی
جو اب ھے وہ کیا جب نہ تھی ذات پات
مگر ایک کی ایک سُنتا تھا بات
غریبی تھی لیکن بھلے تھے سُبھاؤ
بہت تھا امیروں کے دل میں ،، نیاؤ ،،

سَدا لال قلعه میں جاتے تھے هم
جو کچھ مانگتے تھے وہ پاتے تھےهم
کچھ اسوقت کی اور تھی چال ڈھال
نہ تھا آدمیت کا دُنیا میں کال
کسی نے پلٹ کر نہ پُوچھا کبھی
''وکتھا'' بھی سُنی هم نے''پُوجا'' بھی کی
جو ''آن نیاو'' هے آج یہ بھی نہ تھا
کسی کو کسی سے کپٹ بھی نہ تھا
کہاں تک سُناوں میں یہ داستاں
وہ ''بھگوان'' جانے عجب تھا سماں
نہیں آس زمانہ پہ جن کی نظر
اُنہوں نے اُجاڑا هے خود اپنا گھر
جو اس عہد کو جانتے هیں بُرا
اُنہیں کی هے یہ اوچھے پن کی خطا
یہی تھی پُرانے رئیسوں کی بات
کہ وہ تھام لیتے تھے گِرتوں کے هات
وہ دِلّی میں خاصہ کا جو باغ تھا
وهیں هم غریبوں کا تھا جھوپڑا

بہت میں نے گُوندھے ھیں شادی کے ھار
بہت میں نے دیکھی ھے اسکی بہار
چچا کا مرے جب ھوا تھا ''بواہ''
تو اس جھوپڑی تک خود آئے تھے شاہ
بہانہ تھا گو باغ کی سیر کا
مگر اس میں مطلب ھی کچھ اور تھا
غریبوں پہ کرنی تھی کرپا انہیں
بنانا تھا نیچوں کو اونچا انہیں
کہاں اب ھیں ایسے بڑے آدمی
وہ شاھی کی دھج میں تھے سادھو کوئی
رھا ھے مجھے مُدّتوں یہ خیال
کہ اس راج کو ھو گیا کیوں زوال
تو میں نے بس اتنا ھی سمجھا حضور
کہ ھے کچھ نہ کچھ اس میں اپنا قصور
مُقدّر کا اِس میں نہیں کوئی بَل
ملا ھے ھمیں اپنی کرنی کا پھل
کسی کو کوئی دوش دے لاکھ بار
لُٹی ھے یہ اپنے ھی ھاتھوں بہار

غرض وہ کہانی سی کہتا رہا
خیالات کی رَو میں بہتا رہا
حقیقت پہ مبنی تھا ایسا یہ حال
کہ تصویرِ حیرت تھے مرزا کمال
بہت دل ہی دل میں ندامت ہوئی
بہت اُسکی باتوں سے عبرت ہوئی
وہ کہتے تھے دل میں کہ یا ذُوالجلال
یہ پہنچا کہاں سے کہاں اپنا حال
وہ اِسلام وہ مقصدِ کائنات
وہ اِسلام شرحِ نمودِ حیات
وہ اِسلام وہ نغمۂ سازِ حق
زمانے کو جس سے مِلا رازِ حق
وہ اِسلام سرنامۂ کائنات
ہوئی جس سے روشن جَبینِ حیات
وہ اِسلام دردِ محبت کا راز
وہ اِسلام سرمایۂ سوز وساز
وہ اِسلام جس نے یہ تعلیم دی
صداقت کا اک نام ہے زندگی

وہ اِسلام جس نے بتایا یہ راز
کہ دولت نہیں موجبِ امتیاز
وہ اِسلام جس نے سِکھایا یہ گُر
کہ زندہ ہے وہ ہے جو بیدار و حُر
وہ توحیدِ مطلق کے چہرہ کا نور
بڑھا زندگانی کا جس سے سُرور
کہاں ہیں وہ اِسلام کے درد مند
خدا نے جنہیں دی ہے فکرِ بلند
وہ سوچیں ذرا اپنے دل میں یہ بات
مُسلماں وہی ہیں وہی کائنات
زمانے کو ایسا ہی تھا اُن سے بیر
اُٹھاتے ہیں اب اُنگلیاں جن پہ غیر
کہاں ہیں وہ اِسلام کے دیدہ ور
وہ اربابِ دل اور وہ اھلِ نظر
جنہوں نے بتائے حقیقت کے راز
چھِڑا جن کے ھاتھوں صداقت کا ساز
اِسی دُھن میں بیٹھے رہے دیر تک
وہ یہ بات سوچا کئے دیر تک

بہت دیر تک جی تڑپتا رہا
یہ مالی سے آخر انہوں نے کہا
زمانہ یونہیں برسرِ کار ہے
ازل سے یہی اِس کی رفتار ہے
ستم کون گردش کے سہتا نہیں
کوئی ایک حالت پہ رہتا نہیں
اندھیرا کبھی ہے کبھی روشنی
یہی ہے زمانہ یہی زندگی
کبھی ہے تبسّم کبھی آنکھ نم
کبھی عیش و راحت کبھی رنج وغم
مِلی ہے تمہیں خود بھی گہری نظر
کرو غور اپنے ہی حالات پر
نہ وہ تم نہ وہ زندگانی رہی
وہ طِفلی نہ وہ نوجوانی رہی
یہ دامن بھی ہو جائے گا چاک چاک
ہواؤں میں اُڑ جائیگی مُشتِ خاک
مجھے سب سے بڑھکر ہے اسکی خوشی
نہیں تم سے پنہاں رہِ زندگی

سُنا جب یہ تارا نے سب ماجرا
کیا سجدۂ شکر دل سے ادا
ھنسی یہ خبر دے کے رشکِ قمر
شرارت میں ڈوبی ہوئی تھی نظر
کہا دل تمہارا تھا راحت طلب
مبارک ہو راحت ھی راحت ہے اب
اسی طرح راحت بھی تھا شاد شاد
کہ گھر بیٹھے آئی تھی اسکی مراد
یہی فکر اب رہ گئی تھی یہاں
کہ یہ فرض آخر ادا ہو کہاں
کبھی تو یہ آپس میں تھے مشورے
یہیں کیوں نہ دونوں کی شادی رچے
وطن میں بہارِ وطن بن کے جائیں
یہیں سے یہ دولہا دُلہن بن کے جائیں
کبھی یہ کہا ایسی جلدی ہے کیا
نہ ہو کیوں وطن ھی میں یہ فرض ادا
کبھی سب نے ظاہر کیا یہ خیال
یقیناً عزیزوں کو ہوگا ملال

یہی گفتگو ہو رہی تھی ابھی
کوئی بات آپس میں ٹھہری نہ تھی
کہ شادی کی رسموں کا آیا سوال
مُخالف تھے گو سرفراز و کمال
مگر عورتوں کا یہ مفہوم تھا
کہ مانجھا نہ سانچق تو شادی ہے کیا
بَری مہندی ہو لُطف عشرت بڑھے
ذرا رَت جگے ہوں کڑھائی چڑھے
وہ کہتی ہے اکلوتی بچّی مری
میں سب اپنی پوری کرونگی خوشی
اِسی آرزو میں ہوا اتنا سن
نہ آئینگے جاکر مُرادوں کے دن
یہ کہتی مرا اور بیٹا ہے کون
کہ انکے سوا اور میرا ہے کون
یہی ایک ہیں میرے گھر کے چراغ
خدا انکو رکھے سدا باغ باغ
جو دیکھی نہ جی بھر کے انکی خوشی
تو کیا لَوٹ کر آئیگی زندگی

سبھی کچھ ہے گھر میں خدا کا دیا
ہنسے گی نہ دُنیا کہ یہ کیا کیا
غرض عورتوں کو یہ اصرار تھا
مگر اُس سے مَردوں کو انکار تھا
وہ کہتے تھے رسمیں ہیں یہ سب فضول
حقیقت سے دور اور خلافِ اصول
یہ مانا کہ ہم لوگ خُوشحال ہیں
بہ فضلِ خدا فارغ البال ہیں
مگر اِس کا یہ بھی تو مطلب نہیں
کسی کو نہو فکرِ دنیا و دیں
یہ اِسرافِ بیجا کئے جائیں ہم
تباہی کو دعوت دئیے جائیں ہم
یہی مِلتِ حق کا ہے امتیاز
اسی پر ہے کیا دینِ فطرت کو ناز
وہ اِس کا مکمل تَمدُن ہے آج
کسی شئے کی باقی نہیں احتیاج
جہالت کی رسمیں وہ ناقصِ اصول
جنہیں عقل کرتی نہیں خود قبول

انہیں اِک سرے سے مٹا کر رہا
یہ اِنساں کو اِنساں بنا کر رہا
جسے عیش سمجھے ہو آزار ہے
سراسر یہ تقلیدِ اغیار ہے
عرب میں کہیں ذِکر اسکا نہیں
یہ حُکمِ خدا ہے تماشا نہیں
غرض ہر گھڑی گفتگو تھی یہی
کشاکش جو آپس میں بڑھنے لگی
پریشاں سا ہونے لگا کامراں
کہ طبعاً یہ باتیں تھیں آسپر گراں
وہ سوچا کہ بڑھتی رہی ضد اگر
یہ قصّہ نہ ہوگا کبھی مختصر
کوئی بات پیدا نہ ہو ناگوار
خزاں ہو نہ جائے کہیں پھر بہار
بالآخر وہ خود سامنے آگیا
بڑی خوش مزاجی سے کہنے لگا
تہہ دل سے ہے مجھکو اسکا یقیں
یہ میری ہے رَسموں کی شادی نہیں

سُنا یہ تو مان ھنس کے چُپ ہو گئی
کہ تھی سب کو منظور اسکی خوشی
اِسی طرح یہ فیصلہ بھی ھوا
کہ دھلی میں یہ فرض ہونگے ادا

پِلا ساقیا پھر مئے خُوشگوار
چمن در چمن آرھی ھے بہار
وہ مئے دے جو سمجھا ے رازِ حیات
اُلٹ دے حجابِ رُخِ کائنات
ھوئی جس سے پائندہ تر زندگی
جو دُنیا میں انسانِ اول نے پی
ازل سے ھے جس کا زمانہ میں دَور
سکھاتی ھے جو زندگانی کے طَور
جو ھو شرحِ افسانۂ آرزو
چھلکنے لگے ساغرِ رنگ و بو
مہکتی ھوئی مُسکراتی ھوئی
وہ اِحساس کو گُدگُداتی ھوئی

وہ چنچل نگاہوں کی شوخی کا راز
محبت میں ڈوبے دلوں کا گُداز
عیاں جس سے ہو حکمتِ نأو نوش
نہاں جسکی مستی میں آئینِ ہوش
گئے زحمتِ سرگرانی کے دن
یہ ہیں عشرتِ جاودانی کے دن
خموشی نہیں اب گوارا مجھے
بدلنی ہے رِندوں کی دُنیا مجھے
رہوں اِس تکلُف سے ساغر بکف
زمانے کی نظریں ہوں میری طرف
عیاں ہر قدم رازِ تعمیر ہو
لبوں پر حقیقت کی تفسیر ہو
بپا ہو وہ ہنگامۂ نأو نوش
زمانے پہ کُھل جائیں اَسرارِ ہوش
نئی زندگی ہو نئے ہوں اُصول
برسنے لگیں پھر وہ رحمت کے پُھول
دلوں میں تڑپ جائے روحِ عمل
ضیا بار ہوں زندگی کے کنول

۸م جب یہ طے ہو گئے مسئلے
تو مِل جُل کے سب سوئے دھلی چلے
ہوا اھلِ دھلی کو معلوم جب
پلٹ کر بخیر آرہے ھیں وہ سب
عزیز و اقارب ہوئے شادماں
مَسرت کا تھا دوستوں میں سماں
یہ پُہنچی خوشی کی خبر دور دور
برسنے لگا گھر کے ابرِ سُرور
نگاھوں کو راہِ طَرب مِل گئی
رفیقوں کے دل کی کلی کِھل گئی
ملازم تھے محوِ خوشی چار سُو
یہی سب میں ہر پہر کے تھی گفتگو
جو مُرجھا چلا تھا وہ گُل کِھل گیا
پتہ شادمانی کا پھر مِل گیا
ابھی ہو رہے تھے یہ چرچے یہاں
کہ دھلی میں داخل ہوا کارواں
سرِ راہ آنکھیں بچھائی گئیں
وہ گھر گھر میں خوشیاں منائی گئیں

یہ حالت تھی ہر اک بھی خواہ کی
کہ جیسے ہوا پنے ہی گھر کی خوشی
مسرت کے سیلاب کا زور تھا
مبارک سلامت کا اِک شور تھا
سرافراز سے کوئی سُنتا تھا حال
کسی سے مخاطب تھے مرزا کمال
اِدھر گھر میں تھیں عورتیں بے شمار
اُدھر در پہ تھی ڈولیوں کی قطار
چلی آرہی تھیں بہت بی بیاں
زبانوں پہ تھی ایک ہی داستاں
غریبوں کا ڈیوڑھی پہ وہ اژدھام
وہ خیرات کا ہر طرف انتظام
فقیروں کو کھانے کِھلائے گئے
بہت دَر پہ محتاج آئے گئے
یہی فیض کچھ روز جاری رہا
چمن وقفِ بادِ بہاری رہا
اُدھر اہلِ ساگر بھی بیتاب تھے
حقیقت سے بدلے ہوئے خواب تھے

مسرت کی موجیں دلوں میں رواں
زبانوں پہ تھا کامراں کامراں
چلے آ رہے تھے طلب کے پیام
تقاضائے خاص اور تمنائے عام
یہ اِصرار جب حد سے بڑھنے لگا
سرافراز نے عزمِ ساگر کیا
جو عُقدے کہ باقی تھے سُلجھا گئے
وہ شادی کی تاریخ ٹھہرا گئے
مگر یہ بھی ٹھہری کہ اب سرفراز
وہاں کی سکونت سے آجائیں باز
کریں آکے دھلی میں وہ بھی قیام
یہیں ہو تِجارت کا بھی اِنتظام
وہاں جا کے اب کیوں وہ تنہا رھیں
کہ جب ایک ھیں سب تو یکجا رھیں
یہ راحت سے بھی کیگئی گفتگو
کہ ھم سب کے دل کی ھے یہ آرزو
یہیں آکے دھلی میں تم بھی رھو
تجارت جو ھو بمبئی میں تو ھو

کہا اُس نے سُنکر یہ اُن کا خیال
یہ میرا تو پہلے ہی سے تھا خیال
بزرگ ایسے ایسا برادر ملا
مجھے خوش نصیبی سے یہ گھر ملا
غرض پھر وہ ساگر روانہ ہوئے
جہاں منتظر اُن کے احباب تھے
رہا اُن کا ساگر میں جب تک قیام
وہاں بھی رہی راتدن دھوم دھام
تجارت کا دیکھا حساب وشُمار
سَمیٹا وہ پَھیلا ہوا کاروبار
پریشاں اِسی فکر میں تھا جو دل
کیا پہلے سامان سب مُنتقل
ہوا جب ہر اک کام حسب مُراد
تو آنے لگی سب کو دھلی کی یاد
یہاں تک کہ ساگر سے رخصت ہوئے
وہ مِل جُل کے اب سوئے دھلی چلے
سر افراز کی تھی جو کوٹھی وہاں
فروکش اُسی میں ہوا کارواں

ضروری جو تھے ہو گئے جب وہ کام
تو شادی کا ہونے لگا اہتمام
جو دہلی میں اعیان و اَشراف تھے
وہ اَخلاف جو فخرِ اَسلاف تھے
وہ اُس دَور کے اہلِ فضل و کمال
حکومت کے اربابِ جاہ و جلال
سبھی کو گئی یہ نویدِ طرب
باندازِ دلکش بحُسنِ طلب
مِٹا رفتہ رفتہ غمِ انتظار
اُمیدوں کی دُنیا میں آئی بہار
فَضاؤں میں اَبرِ طرب چھا گیا
تمنا تھی جسکی وہ دِن آ گیا
نویدِ خوشی لیکے دعوت کی شام
جب آئی تو آنے لگے خاص و عام
شریف و نجیب و رئیس و امیر
جواں سال کمسن صغیر و کبیر
سعادت پناہ و سیادت نشاں
وہ اربابِ دِل اور وہ اہلِ زباں

کہیں لال قلعہ کے مَسند نشیں
کہیں اہلِ دُنیا کہیں اہلِ دیں
کہیں تیغ زن تھے سُخندان کہیں
سپاھی کہیں اہلِ عرفاں کہیں
قبائیں کِسی صَف میں زیب بدن
انگرکھوں سے پیدا کہیں بانکپن
غرض جنکو آنا تھا وہ آچکے
علم شادمانی کے لہرا چکے
ڈھلا دن ہوا مِہر کو جب زوال
تو آٹھے پھر اپنی جگہ سے کمال
نظر میں تھے دُنیا کے پست و بلند
زباں بن گیا خود دلِ دردمند
کیا شُکر یہ پہلے سب کا ادا
یہ پھر میہمانوں سے اپنے کہا
مجھے عرض کرنا ھے کچھ حالِ دل
میں گو اس جسارت پہ ھوں مُنفعل
مِلے گا مگر پھر یہ موقع کہاں
کہ ھیں جمع اربابِ دانش یہاں

نہ ہو بارِ خاطر جو یہ گفتگو
ذرا سی توجہ کی ہے آرزو
مری آپ سب سے ہے یہ التجا
سنیں گوشِ دل سے مرا مُدعا
ابھی آپکو یاد ہوں گے وہ دن
تصوّر میں آباد ہوں گے وہ دن
وہ دن مُسکراتی تھی جب زندگی
جبینوں میں بَستی تھی تابندگی
وہ دن جب نہ تھی روح مصروفِ خواب
یہ غمگینیاں تھیں نہ یہ اضطراب
وہ دن جب تڑپتی تھی نبضِ حیات
نگاہوں میں تھی منزلِ کائنات
وہ دن جب چھلکتے تھے حکمت کے جام
نہ یہ بیخودی تھی نہ یہ تشنہ کام
وہ دن جب فضائیں تھیں مہکی ہوئی
فروغِ بہاراں سے لہکی ہوئی
وہ دن جب نہ تھا غفلتوں کا یہ جوش
یہ دل تھے نہ یہ قحطِ اربابِ ہوش

برستی تھیں ہر سَمت رعنائیاں
چمن در چمن اور جہاں در جہاں
مگر پھر زمانہ کو کیا ہوگیا
کہ عالَم ہی اک دوسرا ہوگیا
کیا ہے کبھی آپ نے اسپہ غور
بدل کیوں گئے یہ زمانے کے طَور
نئے حشر دُنیا میں برپا ہوئے
وہ راتیں وہ دن اور وہ دل کیا ہوئے
کوئی گر کہے ہے یہ قسمت کی بات
تغیُّر پہ ہے مُنحَصِر کائنات
وہ پستی کا عالَم ہو یا برتری
یہ سب کچھ ہے قسمت کی بازیگری
تو پھر اِس حقیقت کا ہے کیا جواب
کہ ہستی نہیں کوئی آئینِ خواب
یہ ترتیبِ نظمِ دو عالَم ہے کیا
یہ سوز و سکون عشرت وغم ہے کیا
بدلتی ہے سو کروٹیں زندگی
مہکتی ہے جب پھول بنکر کلی

اِسی طرح یہ بھی غلط ہے خیال
کہ دُنیا میں لازم ہے اوج وزوال
تغیُّر کی زد میں ہیں برنا و پیر
ازل سے زمانہ ہے گردِش پذیر
تباہی سے دُنیا کی ہے تال میل
خدا کھیلتا ہے یہ بندوں سے کھیل
تصوُّر ہیں یہ سب سراسر غلط
کہ ہم سوچتے بھی ہیں اکثر غلط
تباہی ہے قوموں کی غفلت کا پھل
یہ ہے اپنی کرنی کا ردِّ عمل
حقائق سے ہوتی ہیں جب بے خبر
گھٹا غم کی چھاتی ہے اقوام پر
تغیُّر کے ہوتے ہیں چرچے کبھی
مقدّر کے ہوتے ہیں شکوے کبھی
کبھی کچھ سکوں اور کبھی اشک و آہ
کبھی فَضلِ غیبی کے اوپر نگاہ
مجھے صِدق دل سے ہے اسکا یقیں
اُسی کا فلک ہے اُسی کی زمیں

وہ حامی اگر ہو تو کیا چاہئے
بہر حال فضلِ خدا چاہئے
مگر یہ بھی تو سوچنے کی ہے چیز
اسی کی عطائیں ہیں عقل و تمیز
باندازۂ حُسنِ ذات و صفات
ہمیں سونپ دی اس نے کُل کائنات
ہر اک ذرّۂ خاک ہے اک جہاں
وہ اَسرار ہیں آب و گِل میں نہاں
وہ تعمیرِ ہَستی کا ہے نقشبند
اسی نے بنائے ہیں پست و بلند
چمن اسکے آئینہ پرداز ہیں
ہر اک پھول میں سینکڑوں راز ہیں
یہ ذرّے جو ہر سو ہیں بکھرے ہوے
یہ قُدرت کے موتی ہیں نِکھرے ہوے
مہ و مہر و انجم ہوں یا روز و شب
کسی شئے کی خلقت نہیں بے سبب
یہ چشمے یہ دریا یہ برگ و نہال
یہ اونچے پہاڑوں کی شانِ جلال

یہ بیوجھ ہیں کیا سجائے گئے
یہ بیکار ہیں کیا بنائے گئے
گھروندا کوئی بزمِ دُنیا نہیں
یہ کٹھ پُتلیوں کا تماشا نہیں
یہ فکر و عمل یہ نشاط و سُرور
کوئی اسمیں پنہاں ہے مقصد ضرور
وہ مقصد یہی ہے یہی ہے وہ راز
نہ ہوں فرض سے اپنے ہم بے نیاز
کبھی غفلتوں کا نہ الزام لیں
ہم انسان ہیں عقل سے کام لیں
خرِد زندگی کی ہے آئیں شناس
خردہی سے مٹتے ہیں وہم و قیاس
خرِد ہے وہ سرمایۂ امتیاز
خدا کار فرما خرِد کار ساز
تباہی جب آتی ہے اقوام پر
خرِد پہلے ہوتی ہے بے بال و پر
خرِد جن زمینوں میں ہے لالہ کار
اُنہیں کے چمن ہیں اُنہیں کی بہار

خِرد ھی سے مِٹتا ھے بِیمِ اجل
خرد ھی سے زندہ ھیں سعی و عمل

خِرد ھے وہ فِطرت کی اک موجِ نور
جو کرتی ھے ذھنوں کی ظُلمت کو دُور

خِرد ھی بتاتی ھے محنت ھے کیا
جو محنت سے ملتی ھے راحت ھے کیا

خِرد ھی سے کُھلتے ھیں حکمت کے باب
یہی درس ھے درسِ اُمّ الِکتاب

طَرازِ مجاز و حقیقت ھے یہ
خدا کی بڑی سب سے نعمت ھے یہ

وہ قوم میں کُھلا جن پہ دانش کا راز
جو قسمت کی ھوتی نہیں شکوہ ساز

رواں جن کی نبضوں میں ھے تیز خون
نہیں جنکو راہِ عمل میں سکُون

سمجھتی ھیں تعمیر ھستی کا راز
بلندی کے آئینِ پستی کا راز

وہ ھر پِھر کے منزِل میں رھتی نہیں
وہ آغوشِ ساحل میں رھتی نہیں

وہ خود اپنی قسمت کی معمار ہیں
وہ دُنیا سے مصروفِ پیکار ہیں
اُلٹتے ہیں تاریخ کے جب ورق
یہ ملتا ہے اہلِ نظر کو سبق
یہ بے بال و پر پیروانِ کلیم
کہ تھے آشنائے زبانِ کلیم
نہ تھا اِن سے بڑھکر کوئی کامیاب
یہ اقوامِ عالم میں تھے اِنتخاب
جبینوں پہ وہ من و سلویٰ کا نور
وہ ایمن کی شاہی وہ اورنگ طُور
کبھی اِسقدر تھے یہ عالی صفات
انہیں کے تھے دن اور انہیں کی تھی رات
یہ تھے ساری دنیا پہ چھائے ہوئے
زمانہ کو اپنا بنائے ہوئے
دماغوں پہ تھا عقل و دانش کا رنگ
خیالوں میں تھی زندگی کی اُمنگ
مگر جب چھڑا غفلتوں کا رَباب
وہ بیداریاں رہ گئیں بن کے خواب

بنی صبحِ عشرت مصیبت کی شام
بگڑنے لگے بن رہے تھے جو کام
بڑھیں ظُلمتیں ڈھل گیا آفتاب
ہوئی زہرِ غم زندگی کی شراب
وہی کجروی تھی وہی گُمرہی
جو قوموں کو برباد کرتی رہی
بدل کر رہے اُن کے لیل و نہار
خزاں نے اُلٹ دی بساطِ بہار
گھٹا زورِ بازو وہ کس بل گیا
وہ خورشیدِ اقبال بھی ڈھل گیا
زوال آفریں عظمتیں ہوگئیں
وہ سب نعمتیں لعنتیں ہوگئیں
یہ رہرو کہاں تھے زمانہ کہاں
شب آخر ہوئی پھر فسانہ کہاں
ہزاروں ہی دُنیا نے پلٹے لئے
اُمیدوں نے کیا کیا نہ دھوکے دئے
جو وقت آچکا تھا نہ پھر ٹل سکا
مشیّت پہ کوئی نہ بس چل سکا

وہ فکر و نظر تھی نہ ذہن و دماغ
اس آندھی میں گُل ہوگئے یہ چراغ
حقیقت ہے یہ کس قدر ناگوار
کہ ہم سا نہیں کوئی ناکامگار
نہ وہ زندگی ہے نہ اقبال ہے
ہمارا بھی ایسا ہی کچھ حال ہے
کبھی ایک عالم تھا زیر نگیں
ہمیں اب کوئی پُوچھتا بھی نہیں
کبھی اپنے قبضہ میں تھے تخت و تاج
ہمیں اک جہاں دے رہا تھا خراج
زمانہ کی ہم پر کبھی تھی نظر
ہمیں دیکھتے ہیں اب اسکی نظر
یہ بازارگیوں کے یہ پیچ و خم
یہ بھرپور نہریں یہ موجوں کا رم
درختوں کی یہ دونوں جانب قطار
یہ اس عہد عشرت کی ہیں یادگار
یہ منظر کبھی شاد و آباد تھے
زمانہ کی گردش سے آزاد تھے

کہاں اُڑ گیا اُن کے چہرہ کا رنگ
یہ کیوں بُجھ گئی اُن کے دل کی اُمنگ
انہیں کون رستہ سے بھٹکا گیا
زمیں کھا گئی آسماں کھا گیا
وہ عِشرت کے ساماں کدھر کھو گئے
وہ بیدار دل اب کہاں سو گئے
وہ اخلاص کی لذّتیں کیا ہوئیں
وہ کردار کی عظمتیں کیا ہوئیں
محبت کی بیداریاں کیا ہوئیں
وہ ہوش اور وہ سرشاریاں کیا ہوئیں
وہ محفل کے شیریں نوا کیا ہوئے
وہ اب صف شکن سُورما کیا ہوئے
وہ احساسِ باطن وہ حُسنِ ضمیر
یہ آزادیاں کس نے کرلیں اسیر
نہ وہ ہمتیں ہیں نہ وہ حوصلے
نہ وہ دل ہیں اب اور نہ وہ وَلوَلے
نہ وہ نورِ شیب اور نہ رنگِ شباب
کوئی ہم نے شائد یہ دیکھا تھا خواب

یہ الفاظ ہیں صاف قرآن میں
خداوندِ ہستی کے فرمان میں
کہ جو قوم بے راہ چلتی نہیں
کبھی اسکی حالت بدلتی نہیں
مشیّت کا منشا ہی کچھ اور ہے
یہ اِرشاد بھی قابلِ غور ہے
اگر دیکھ بھی لو گھنی چھاؤں تم
نہ بیٹھو کبھی توڑ کر پاؤں تم
ہمارا ہر اک سانس میں نام لو
مگر عقل و دانش سے بھی کام لو
تمہارے تصرّف میں ہے کُل جہاں
عطائیں ہماری نہ ہوں رائیگاں
یہ اندیشۂ ناتمامی کہاں
کہاں تم مقامِ غلامی کہاں
بتایا گیا ہے یہی بار بار
کہ انساں جو قُدرت کا ہے شاہکار
نہ تنظیمِ قدرت میں ڈالے خلل
رہے ہر نفس محوِ سعی و عمل

مگر ہم ہیں بیگانۂ چشم و گوش
نہ اپنی خبر ہے نہ دُنیا کا ہوش
نہ سوچا کبھی رازِ ہستی ہے کیا
ہماری زمانے میں ہستی ہے کیا
رہے بختِ ناساز کے نوحہ گر
مگر اپنے کردار سے بے خبر
یہ آتی نہیں اب کچھ اپنے کئے
کہ انعامِ قدرت کے سب کھو دئے
جو دریا تھے اُترے ہوئے چڑھ گئے
جو پیچھے تھے وہ قافلے بڑھ گئے
حریفِ رہ و رسمِ قرآں بھی ہیں
یہ حالت ہے پھر ہم مسلماں بھی ہیں
یہی آخری حق کا پیغام ہے
یہ اوہام کی پوٹ اسلام ہے
بلندی یہی ہے تو پستی ہے کیا
یہ حق ہے تو باطل پرستی ہے کیا
یہ آگاہِ اسرارِ توحید ہیں
یہ بندے پرستارِ توحید ہیں

یہی لائقِ لُطف و انعام ہیں

یہی زینتِ بزمِ اسلام ہیں

فقط چند رسمیں ہیں اوہام ہیں

جو سرمایۂ شرعِ اسلام ہیں

مجھے آرہا ہے یہ پیہم خیال

یہاں سب کے دل میں یہ ہوگا سوال

کہ شادی میں یہ غم نوائی ہے کیا

خوشی میں یہ نوحہ سَرائی ہے کیا

یہ کیسی ہے بیوقت کی راگنی

یہ شادی ہے یا ماتمِ زندگی

نہ تاشے نہ باجے نہ کچھ ناچ رنگ

یہ بزمِ طرب ہے کہ میدانِ جنگ

نہ مانجھا نہ منہدی نہ سانچق کی دھوم

نرالی ہے محفل انوکھے رسوم

یہ رسمیں ہیں شادی کے دن کا سنگھار

یہ آتے ہیں موقع کہیں بار بار

کہاں جشنِ شادی کہاں وعظ و پند

بڑے آپ ہیں قوم کے دردمند

مرے دوستو کچھ توقف کرو
بتاتا ہوں اس کا سبب بھی سُنو
یہ سچ ہے کہ مشکل نہ تھا ناچ رنگ
مرے دل میں بھی ہے خوشی کی اُمنگ
مگر میں نے جیسا کہا ہے ابھی
یہ رسمیں ہیں سب دُشمنِ زندگی
ہمیں لا رہی ہیں یہ سوئے زوال
تباہی کی منزل ہے اِن کا مآل
کوئی ہے جو اِس سے نہ ہو باخبر
نہیں اس سے آگاہ کِس کی نظر
یہ رسمیں ہیں وہ خوبصورت گُناہ
کئے جس نے لاکھوں گھرانے تباہ
جہاں جُھولتے تھے کبھی فیلِ مست
وہاں اب امارت ہے کاسہ بدست
جہاں سازِ عشرت کے تھے زیر و بم
وہاں گونجتی ہے اک آوازِ غم
جہاں نگہتِ گُل تھا ایک اک نفس
دُھواں اب ہے آہوں کا یا خار و خس

یہ صرف ایک شادی کی ہے رسم کیا
کہ آوے کا آوا ہے بگڑا ہوا
یہی حال دورِ نبوّت میں تھا
یہی رنگ عہدِ سعادت میں تھا
یہ انداز عہدِ خلافت کے تھے
امامت نے جائز کیا تھا اِسے
وہ بنتِ نبیؐ فخرِ کون و مکاں
فدا جن پہ ایسے ہزاروں جہاں
نبوت نے دامن میں پالا جنہیں
حقیقت نے جُھولا جُھلایا جِنہیں
اُنہیں کا تھا وہ آستانہ جہاں
دوعالَم جُھکاتے تھے پیشانیاں
جُھکی تھی جہاں قُدسیوں کی جبیں
کُھلے جن کے صدقہ میں اَسرارِ دیں
کچھ ایسے درخشاں تھے اُنکے صفات
کہ سُلطان دیں سرورِ کائناتؐ
بہت اُنکی سیرت سے تھے شادکام
وہ کرتے تھے بیٹی کا خود احترام

وہ دونوں جہاں کی تھیں مالک مگر
عجب حال میں زندگی کی بسر
نہ روٹی کبھی پیٹ بھر کر ملی
ملی تو شکستہ سی چادر ملی
ہوئی ان سے اسلام کی زیب و زین
بڑھے انکے سایہ میں پل کر حسینؑ
حسینؑ امرِ حق شرحِ رازِ حیات
جنہیں بھول سکتی نہیں کائنات
حسینؑ اس زمیں کے وہ ماہ کمال
سراپا حقیقت تھا جن کا جمال
حسینؑ اہلِ عرفان کو ہے جن پہ ناز
ملا جن کے غم سے دلوں کو گداز
حسینؑ آج تک جن کا عزم و ثبات
زمانے کو دیتا ہے درسِ حیات
بتائی جنہوں نے صداقت کی راہ
ملی جن کے دامن میں حق کو پناہ
کچھ ایسے ہیں گہرے قدم کے نشاں
کہ ہے منحصر جن پہ یہ کارواں

حقیقت کی اِسطرح تدوین کی
بِنا پھر سے مُحکم ہوئی دِین کی
بتاؤ یہی اِن کی سیرت تھی کیا؟
یہی ان کی شانِ طبیعت تھی کیا؟
یہی اُسوۂ عِترتِ پاک ہے
جوا کسیر تھی وہ یہی خاک ہے
یہ بِدعت تھی آنکے زمانے میں بھی
یہ رسمیں تھیں آنکے گھرانے میں بھی
یہی کیا طریقے تھے اَسلاف کے؟
یہی رنگ تھے انکے اِسراف کے؟
یونہی تھی آنہیں فکرِ نام و نمود
خیالِ عدم تھا نہ فکرِ وجود
یہی مِلّتِ حق کا آئین ہے
یہی ہے شریعت یہی دین ہے
کہیں اِسکی رُوداد بھی اب نہیں
سُنا تھا جو کچھ یاد بھی اب نہیں
نظر کھا رہی ہے فَریب نظر
خیال اَب یہ آتا نہیں بُھول کر

یہ کردارِ دل جس سے ہے باغ باغ
یہی ہیں شریعت کے ماتھے کا داغ
ستم ہے کہ ہو جائیں خوابِ گراں
قُرونِ سعادت کی بیداریاں
یہ سب کچھ ہے صرف اِس خطا کا مآل
کہ سمجھے تھے دولت کو ہم لازوال
بڑھا اِسقدر زور و طاقت پہ ناز
خودی نے خدا سے کیا بے نیاز
ہوا اور قوموں سے جب میل جول
اُترنے لگے دل میں غیروں کے بول
خیالوں میں رنگینیاں آگئیں
نِگاہوں پہ خود بینیاں چھا گئیں
وہ سعی و عمل اور وہ سطوت گئی
جو سَر دیکے پائی تھی عظمت گئی
حقیقت رہی ہے یہ دُنیا میں عام
کہ اِسلام ہے دینِ فطرت کا نام
مِلے اِسکے سایہ میں بے قید و بند
دلِ بے ریا اور نگاہِ بلند

یہ پروردۂ قصر و ایواں نہ تھا
یہ بیگانۂ عقل و عِرفاں نہ تھا
مِلا جن کو اِسلام سے امتیاز
جو اربابِ دانش تھے آگاہِ راز
نہ تھا ان کی طِینت میں مکر و فریب
نہ جھوٹی تڑپ تھی نہ جھوٹا شکیب
رِیا شاملِ حُسنِ سیرت نہ تھی
سیاست حریفِ صَداقت نہ تھی
محبت اگر تھی تو بے لوث و پاک
وہ خُلقِ حَسن اور وہ طرزِ تپاک
نہ تھی اُن کی تہذیب صنعت کا جال
نہ پندارِ دانش نہ فخرِ کمال
جبینوں پہ غازوں کی تابش نہ تھی
پسند اُن کو جھوٹی نُمائش نہ تھی
مساوات تھی اُنکے چہروں کا نور
حکومت پہ ناز اور نہ زر کا غُرور
وہ خوکردۂ خود پرستی نہ تھے
یہ بندے خداوندِ ہستی نہ تھے

یہ تھا جاھلّیت میں بھی اُن کا حال
وہ مہماں نوازی میں تھے بے مثِال
ھوا جبکہ اِسلام جلوہ فگن
تو کچھ اور نِکھرا وہ رنگ کُہن
مُنظّم ھوئی اب یہ قومِ غیور
ملا زندگی کا نیا اک شعور
وہ سایہ میں اِسلام کے آ گئے
وہ آنّھے بڑھے خَلق پر چھا گئے
تمھارے جو آبا و اجداد تھے
اسی طرح کیا خانہ برباد تھے ؟
یونہی تھے وہ دولت کے نشہ میں چُور
اِسی طرح تھے آدمیّت سے دُور
تمہارا سا ان کا بھی تھا رنگ ڈھنگ
یونہی تھے وہ بیگانۂ نام ونَنگ
انہیں بھی حقیقت سے تھا اجتناب
اِسی طرح غفلت کے طاری تھے خواب
یونہی زندگی ان کی بے جان تھی
یہی ان کے تیور یہی شان تھی

دماغ اُن کے تھے اور دل اُن کے اور
وہ کرتے تھے آئینِ ہستی پہ غَور
یہ قومیّت ونسل کا اِمتیاز
بہت جس پہ ہے عہدِ حاضر کو ناز
یہ اِسلام کا وہ تمدُّن نہیں
پنپنے کے دُنیا میں یہ گُن نہیں
اِسی طرح تہذیبِ نَو کے اصول
یہ ھیں اصل میں نوعِ انساں کی بھول
یہ علمِ وفراست کی افسُوں گری
یہ احساسِ خود بینی وخود سَری
یہ آئینِ فطرت کی توھین ہے
یہ دولت کے بندوں کا آئین ہے
چھڑا اھلِ دولت کے ھاتھوں یہ ساز
کہ انساں اور انساں میں ہے اِمتیاز
اِسی نے کیا زندگی کو زبوں
سُنایا یہ افسانۂ رنگ وخوں
مٹی اس سے آزادئ فکر و رائے
اِسی نے غلامی کے سانچے بنائے

مِٹائے ھیں اِس نے سکون و شکیب
سیاست کہاں ھے کہ ھے یہ فریب
اُجاڑے چمن وادیاں چھین لیں
زمانے سے آزادیاں چھین لیں
مساوات و انسانیّت کے اُصول
یہ کرتی نہیں ایسی باتیں قبول
محبّت کے جذبے دَباتی رھی
عداوت کے طُوفاں اُٹھاتی رھی
اِسی کی بدولت ھے غفلت کا جوش
یہی بزمِ عشرت میں ھے مئے فروش
سِتم اِس کے دنیا میں ھیں بے قیاس
یہ اکثر لہو سے بُجھاتی ھے پیاس
غرض ہم سے عیشِ دُروں چھن گیا
دلوں میں جو تھا وہ سُکوں چِھن گیا
گئیں حِکمتیں وحشتیں چھا گئیں
خط و خال پر ظُلمتیں چھا گئیں
بھنوَر کے اِشاروں پہ رقصاں ہوئی
یہ کشتی یونہی غرقِ طوفاں ہوئی

کسی کام کا جب سلیقہ نہ ہو
کوئی زندگی کا طریقہ نہ ہو
جہاں فکرِ فردا سے گھبرائے دِل
جہاں عیشِ حاضر میں کھو جائے دِل
تو اَخلاق میں پستیاں کیوں نہ ہوں
یہ بے جا زبردستیاں کیوں نہ ہوں
زمانہ بہت قابلِ غَور ہے
ابھی اور کچھ تھا ابھی اور ہے
یہاں بے دَوِش راہ ملتی نہیں
کَلی بے خَلش کوئی کِھلتی نہیں
ازل سے یہی آب و گِل کا ہے رنگ
طَبیعت کی فطرت سے رہتی ہے جنگ
نہ ہو جن میں احساسِ سعی و عمل
وہ اقوام جیتی نہیں اپنے بَل
غرض اب کہاں تک یہ طولِ کلام
مجھے خود ہے معلوم اپنا مقام
مری اس جسارت کے ہیں دو سبب
بیاں جن کو آخر میں کرتا ہوں اب

سمجھ لیں مرے میہماں بالعموم
یہ شادی ہوئی کیوں خلافِ رُسوم
کروں عرض کیوں کر سبب دوسرا
کہ عنوان ہے اس کا بِالکُل نیا
اِدھر دیکھئے وہ جو ہیں مردِ پیر
اِنہیں یاد ہے عہدِ تاج و سریر
یہ مجھ سے نہ میں ان سے تھا آشنا
مگر اِتفاقاً تعارُف ہُوا
یہ مالی ہیں نام اِن کا ہے چندر بھان
یہیں شاہی باغوں کے تھے باغبان
مگر ہیں بڑے صاحبِ فکر و غَور
کہ آنکھوں سے دیکھا ہے شاہی کا دَور
ہماری طرح دل ہے ان کا حَزیں
یہ اِس غم میں کچھ ہم سے پیچھے نہیں
ہوئی اِن سے اک روز جب گفتگو
وہ عُقدہ کُھلا جس کی تھی جُستجو
اُٹھائے نگاہوں سے کیا کیا حجاب
دِکھائے مجھے منظرِ اِنقلاب

بتایا ہماری تباہی کا راز
بڑھا جب سے کچھ اور دل کا گداز
زمانے کو احساس ہو اس قدر
غضب ہے کہ ہم خود رہیں بے خبر
ہماری تباہی کا یہ غم کریں
ہمیں اپنی جانب نظر کم کریں
یہ بیدار ہوں اور ہم محوِ خواب
مگر ایسی غفلت کا ہے کیا جواب
نظر ان کی ہے واقفِ روز و شب
یہ مالی سہی میرے بھائی ہیں اب
اسی سلسلہ میں یہ کہنی ہے بات
کہ اک انکی بیٹی بھی ہے خوش صفات
بہن جانتا ہوں قمر کی اسے
بنایا ہے منہ بولی بیٹی اسے
مرے سامنے ہیں جو یہ نوجواں
بشر ایسے ہوتے ہیں پیدا کہاں
کرم ان کا ہے مجھ پہ حد سے فزوں
میں احسان سے انکے ہوں سرنگوں

لڑکپن سے ھے بمبئی میں قیام
یہ مشہور تاجر ھیں راحت ھے نام
غریبوں کی راحت ھے اِن کا وجود
امیروں میں حاصل ھے نام و نمود
یہ بات اُنکی سیرت سے ھے آشکار
محبت سے ھے زندگی استوار
اُسی کی رَوِش ھے خدا کو پسند
جو اَوروں کے غم سے بھی ھو دردمند
محبت سے لبریز ھے اِن کا دل
وہ اَخلاق وہ سیرت مستقل
مجھے جس نے آزادِ حرماں کیا
مرے مُضمحل دل کو شاداں کیا
یہ ھیں کامراں کی طرح کامگار
بہت کچھ ترقی پہ ھے کاروبار
غریبوں کی خدمت ھے اِن کا اُصول
ھوئے خار اِن کی عنایت سے پھول
حریفِ خُرافات و اوھام ھیں
کہ یہ واقفِ روحِ اِسلام ھیں

سرافراز کے ہیں یہ آرامِ جاں
سمجھتے ہیں بھائی انہیں کامراں
سُنیں اور نہ دیکھیں یہ ہمدردیاں
یہی زندگی کی ہیں پامردیاں
نہ زعمِ نسب ہے نہ پروائے نام
دیا مجھکو تارا کا خود ہی پیام
نہیں اُس کے والد کو بھی اختلاف
وہ اپنی رضا دے چکے صاف صاف
یہ پیوند راحت نے سمجھا مُباح
یہیں آج اُن کا بھی ہوگا نکاح
مبارک ہوں یہ خانہ آبادیاں
مرے گھر میں ہیں آج دو شادیاں
یہ دولہا جو ہیں راحت و کامراں
مسّرت کی محفل کے رُوحِ رواں
کِھلا ہے اُمیدوں کا جن کی چمن
مرا اُن کی جانب ہے روئے سُخن
سُنیں غور سے اب یہ میرا بیاں
مرے لختِ دل راحت و کامراں

میسّر ہے گو عیش و عشرت انہیں
خدا نے عطا کی ہے راحت انہیں
نہیں ہے انہیں کوئی دُنیا کا غم
کہ ہر حال میں ہے خدا کا کرم
وہ سیرت ملی ہے انہیں دلپذیر
برائی سے ہیں پاک ان کے ضمیر
مگر دیکھنا ہے اب ان کا شعار
کہ اب اور کچھ ہوں گے لیل و نہار
یہ رُخ زندگی کا بدلنے کو ہے
نئے دن کا سُورج نکلنے کو ہے
یہ محفل رہے گی نہ یہ سرخُوشی
نیا دَور ہوگا نئی زندگی
یہ مانا بلند ان کے معیار ہیں
یہ ہر نیک و بد سے خبردار ہیں
مگر فرض باقی ہے میرا ابھی
مجھے بھی ہے کچھ ان سے کہنا ابھی
یہ منزل کڑی بھی ہے آسان بھی
یہاں گُمرہی کا ہے امکان بھی

بہت کم ہے کوئی اسے سوچتا
کہ دُنیا میں شادی کا مقصد ہے کیا
یہ ہے دودِلوں کی محبت کا عہد
بہم جستجوئے سعادت کا عہد
اِسی سے ہے رعنائی کائنات
اِسی پر ہے قائم نظامِ حیات
اِسی سے ہے رنگینئ برگ و بار
اِسی سے ہے اِس گُلستاں کی بہار
یہی راز ہر شادمانی کا ہے
یہی مُدعا زندگانی کا ہے
ازَل میں چِھڑا جب سُرود حیات
اُٹھی لیکے انگڑائیاں کائنات
باندازۂ فطرتِ روزگار
ہوئی دست قدرت سے تقسیم کار
ہر اك اپنی جگہ پا گیا
زمیں بِچھ گئی آسماں چھا گیا
فلك پر ہوئے جلوہ گر مہر و ماہ
زمیں پر نمایاں ہوئے کوہ وکاہ

سحر کو جو بیداریاں دی گئیں
بہاروں کو گلباریاں دی گئیں
گلستاں کو حسن و جوانی ملی
سمندر کو رقص و روانی ملی
شبوں کو سیاہی عطا کی گئی
ستاروں سے روشن فضا کی گئی
زمیں کی طبیعت میں کردی نہاں
زر وسیم کی دولتِ بیکراں
جوانی کو احساسِ رفعت ملا
دلوں کو غرورِ محبت ملا
دماغوں کو پرواز عقل و شعور
خیالوں کو وسعت نگاہوں کو نور
ملا مرد کو کاروبارِ حیات
بنیں عورتیں مادرِ کائنات
اسے عزم و ہمت کی دولت ملی
اُسے پھول کی سی لطافت ملی
اِسے واقفِ زورِ طوفاں کیا
اُسے زینتِ بزمِ دوراں کیا

اِسے کاوشِ مستقل بخشدی
اُسے رونقِ آب و گِل بخشدی
اِسے دھر کی پاسبانی مِلی
دِلوں پر اُسے حکمرانی مِلی
اِسے ہمتِ فتح پیکار دی
اُسے نرمیٔ حُسنِ گُفتار دی
اِسے بیخودِ کیف و کم کردیا
اُسے وقفِ اَجزائے غم کردیا
اِسے عزمِ بیدار کے ڈھب ملے
اُسے مُسکراتے ہوئے لَب مِلے
اِسے ہر نَفس بیقراری مِلی
اُسے گھر مِلا خانہ داری مِلی
یہ تھی زینتِ محفلِ آب و گِل
دیا اُسکو اُلفت سے لبریز دِل
وہ دِل جسپہ قدرت کو خود ناز تھا
جو تخلیق کا مَحرمِ راز تھا
ہوا حُکم تدبیر ہستی کریں
یہ مِل جُل کے تعمیر ہستی کریں

زمانے کی تنظیم بھی ہو گئی
فرائض کی تقسیم بھی ہو گئی
یہ عورت کا ہے فرض بے اشتباہ
رہے ہر نفس مسکراتی نگاہ
مصیبت میں تسکیں کا ساماں کرے
محبت سے مشکل کو آساں کرے
کشاکش میں دنیا کی گھبرا نہ جائے
زمانے کی رفتار پر آ نہ جائے
حدیثِ محبت سناتی رہے
مصیبت میں بھی مسکراتی رہے
جو شوہر کی ہمدرد و دمساز ہو
وفا کیش ہو محرمِ راز ہو
اسی طرح ہیں مرد کی یہ صفات
کہ ہو مرکزِ زندگی اسکی ذات
رہے اسطرح محو سعی و عمل
کبھی اسکے تیور پہ آئے نہ بل
وہ ہر ایک منزل میں سمجھے یہ بات
کہ بیوی ہے اسکی شریکِ حیات

جو بیوی میں پاتا ہو کوئی قصور
تو حُسنِ عمل سے کرے اسکو دُور
بنائے جو یوں زندگی کا نظام
نہ محسوس ہو گردشِ صبح و شام
جو فکر و عمل سے گریزاں نہ ہو
غمِ زندگی سے پریشاں نہ ہو
یہاں ڈوب کر جو اُبھرتا رہے
جو طوفان کو فتح کرتا رہے
اگر ہوں یہی زندگی کے اصول
تو مُرجھا سکیں گے نہ عشرت کے پھول
وہ عورت ہو یا مردِ لشکر شکن
سُنے گوشِ دل سے یہ میرا سُخن
کریگا نہ جو فرض اپنا ادا
وہ پائے گا ان غفلتوں کی سزا
چلیں گے جو فرض اپنا پہچان کر
رہے گا مسّرت سے آباد گھر
قدم اِس سے ہٹ کر پڑے گا اگر
نہ طے ہو گا پھر زندگی کا سفر

هراک گام پر ٹھوکریں کھائینگے
مسرّت کے تیور بدل جائینگے
ہَوا شادمانی کی رُک جائیگی
کمر زندگانی کی جُھک جائیگی
الٰہی یہ میری دُعا ہو قبول
مُرادیں ہوں سب اِن کے دِل کی حُصول
مبارک ہو اِن کو نئی زندگی
مِلے ہرنفس اِک نویدِ خُوشی
یہ دستورِ فطرت پہ چلتے رہیں
یونہی پھُولتے اور پھَلتے رَہیں
یہ دُنیا کو آئینِ حکمت بتائیں
اِسی طرح سب کی مُرادیں برآئیں
محبّت کا اِنکو مِلے سوزوساز
ترے فَضل سے اِنکی عُمرین دراز
یہ کہکر ہوئے چُپ جو مرزا کمال
عجب ہوگیا بزمِ شادی کا حال
صَداقت کی ہر لفظ مین تھی کھَٹک
خموشی سی طاری رہی دیر تک

مَراسِم ہوئے عقد کے پھر ادا
مبارک سلامت سے نکھری فضا
لبوں پر تبسُّم جَھلکنے لگے
مسرّت سے چہرے دَمکنے لگے
ہوائے طرب رُوح پر چھا گئی
سرِ بزم بجلی سی لہرا گئی
سُرورِ حیات آفریں بڑھ گیا
دلوں کا دھڑکنا کہیں بڑھ گیا
کِھلا ہر طَرف اِک خوشی کا چمن
دُلہن بَن گئی یک بیک انجمن
تو دعوت کا ہونے لگا اہتمام
ہوئے میہماں سب شریک طعام
رہا نصف شب تک یہ رنگیں سماں
یہاں تک کہ رُخصت ہوئے میہماں
بڑی چِپقلش تھی بڑا اژدہام
قناتوں کا ہونے لگا اِنتظام
صدائیں کہاروں کی آنے لگیں
کہ پھر ڈولیاں آنے جانے لگیں

کہیں کوئی انّا تھی گرمِ کلام
تو دیتی تھی ماما کسی کو پیام
بڑی کشمکش تھی بہت بھیڑ بھاڑ
کہیں بولی ٹھولی کہیں چھیڑ چھاڑ
غرض رفتہ رفتہ چھٹا وہ ہجوم
سدھارین دمِ صبح جیسے نجوم
نظر آئی اک سطح ہموار سی
فضا میں تھی اک موجِ سرشار سی
ضیائے قمر جلوہ آرا کہیں
چمکتا تھا قسمت کا تارا کہیں

ازل سے یہی ہے نظامِ حیات
کہ ہے وقفِ سعی و عمل کائنات
یہاں ذرّہ ذرّہ ہے سرگرمِ کار
سکوتِ خزاں ہو کہ موجِ بہار
ہر اک شئے ہے مصروفِ سعی و عمل
وہ کانٹے ہوں یا مسکراتے کنول
ستارے مہ و مہر کا یہ نظام
یہ ہنگامۂ گردشِ صبح و شام

زندگی سعی و عمل کا نام ہے

زمانے کی ہر شئے ہے سرگرمِ سیر
کہ ہے خواب سے روحِ گیتی کو بیر
یہی سازِ ہستی کا ہے زیر و بم
فضاؤں میں رقص اور ہواؤں میں رم
معاون نہ ہو سعیٔ دہقاں اگر
تو یہ لالہ کاری نہ ہو خاک پر
چمن خود بخود لہلہاتا نہیں
شگوفہ کوئی مسکراتا نہیں
زمانہ ہے اک قلزمِ بیکراں
سبک سیر موجیں ہیں جسمیں رواں
اسی رو میں ہے کشتیٔ زندگی
کہیں ہیں بھنور اور کہیں تیرگی
یہاں چاہئیے بازؤوں میں وہ زور
دبا دے جو طوفانِ ہستی کا شور
جو انساں ہیں آگاہ سعی و عمل
مٹاتے ہیں وہ زلفِ دوراں کے بل
یہ تقدیر پر اپنی روتے نہیں
کسی حال میں عقل کھوتے نہیں

یہ نامحرمِ خوابِ ساحل نہیں
یہ بیگانۂ رازِ منزل نہیں
یہ ہیں بے نیازِ سکونِ حیات
مسافر یہ دن دیکھتے ہیں نہ رات
مصیبت میں کھوتے نہیں یہ حواس
پھٹکتے نہیں رنج وغم آس پاس
بلندی سے عاجز نہ پستی سے بند
یہ ہموار کرتے ہیں پست و بلند
یہ طوفاں بھی ہو گر تو رُکتے نہیں
یہ مجبوریوں میں بھی جُھکتے نہیں
یہ سُن لیتے ہیں زندگی کا پیام
کہ ہے جیتے جی نا اُمیدی حرام
رَوِش آنکی ہے پئے بہ پئے زندگی
کہ سعی وعمل ہی میں ہے زندگی
مری مثنوی کا ہے مقصد یہی
یہ ہے درسِ رسم و رہِ زندگی
ابھی کامراں عیش وراحت میں تھا
ابھی سو طرح کی مُصیبت میں تھا

ھوا سیر دوراں کا آسکو خیال
مگر از رہِ اکتسابِ کمال
سبق عزم وِ ہمت کا پاتا رہا
غمِ دھر پر مُسکراتا رہا
کبھی وادی سبز و شاداب میں
کبھی تھا وہ آغوشِ گِرداب میں
پڑھیں غور سے اِس کو اھلِ نظر
کہانی نہیں سَرگُذشتِ قمر
رھا گو مُخالف بہت آسماں
مگر یہ حقیقت ھے اِس سے عیاں
کہ غم بَن کے رھتا ھے کیونکر خوشی
یہاں تشنہ کامی بھی ھے سَرخوشی
نہیں یہ فقط دِلنوازی کا درس
یہ ھے عصمت و پاکبازی کا درس
اِسی طرح راحت کا ھے اك مقام
محبت کا ملتا ھے جس سے پیام
یہ راحت کی سیرت سے ھے آشکار
محبت سے ھے زندگی کامگار

وہ انساں ہے سرنامۂ روزگار
جو اوروں کے غم میں رہے بیقرار
جو ہستی کے عُقدوں کو سُلجھا سکے
مصیبت میں دُنیا کے کام آسکے
بتاتی ہے یہ سیرتِ باغباں
کسی سے نہیں رازِ ہستی نہاں
کہاں زُلفِ دوراں سنورتی نہیں
کہ فطرت کبھی بُخل کرتی نہیں
غرض جس قدر اِس میں کردار ھیں
نہاں اُس میں ہَستی کے اَسرار ھیں
کوئی عہدِ ماضی کا آئینہ دار
کسی میں ہے ایّامِ نو کی بہار
یہی اِس مُرقّع سے ھے آشکار
کہ ہے زندگی کا عمل پرمدار
مصائب کے عالَم میں عَزم و ثبات
یہی زندگی ہے یہی کائنات
نہ غفلت نہ بیمِ اجل چاھئے
یہاں صِرف ذوقِ عمل چاھئے

”کتاب خانہ“ [illegible]

قیمت فائن آرٹ پیپر مجلد (۱۰) روپے

چکنا ولایتی کاغذ مجلد (۷) روپے

مطبوعہ دارالطبع سرکارعالی حیدرآباد دکن

سنہ ۱۹۴۶ع / ۱۳۶۵ھ